طلوعِ اسلام

جنوری

سنہ ۱۹۵۵ء

دس آنے

پاکستان میں نظام شریعت رائج ہونا چاہئے ۔

لیکن یہ نظام شریعت ہوگا کیا ؟

(۱) اقتدار اعلیٰ خدا کا ۔ اطاعت صرف اس کی ۔

(۲) خدا کی اطاعت کے معنی ہیں اسکی وحی کی اطاعت ۔

(۳) ایک وحی قرآن میں ہے ۔ لیکن وہ مجمل ہے ۔

(۴) اس اجمال کی تفصیل دوسری وحی میں ہے جس کا نام احادیث ہے ۔

(۵) لہذا خدا کی اطاعت سے مراد احادیث کا اتباع ہے ۔

لیکن.... احادیث غلط بھی ہیں اور صحیح بھی ۔

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟

یہ صرف.... مزاج شناس رسول بتا سکتا ہے ؟

یہ مزاج شناس کون ہیں ؟

اسکی تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی تازہ ترین پیشکش

مزاج شناس رسول

میں دیکھئے ۔ ضخامت ۴۴۸ صفحات ۔ مجلد مع گرد پوش ۔

قیمت -/۴ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		" غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۸	جنوری ۱۹۵۵ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

لمعات	۴-۶	۱- یذبحون ابناءھم	
ہفتہ وار طلوع اسلام	۷-۹	۲- مفتیوں کے فتوے	
طاہرہ کے نام	۱۱-۱۸	۳- خزائن ودفائن	
(محترم پرویز صاحب)		۴- بھلا بتایئے تو!	
اسلام پر مختلف غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات	۱۹-۳۴	اسلام عصرِ حاضر میں	۴۳-۶۴
(علامہ محترم احمد امین صاحب)		(محترم احمد محی الدین صاحب انصاری)	
افکارِ اسلامی کی تشکیل جدید	۳۵-۳۹	رفتارِ عالم	۶۵-۷۳
عقائق وعبر	۴۰-۴۲	اشتہار	۷۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنانے کی اسکیم جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے وہ اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ جب کوئی صاحب ہمت کسی بات کا عزم کر لیتا ہے تو پھر رکاوٹیں خود بخود راستہ سے ہٹتی چلی جاتی ہیں ورنہ یہی مسئلہ اگر (مرحوم) مجلس آئین ساز کے سپرد کر دیا جاتا تو آپ دیکھتے کہ سات برس میں اس کی تمہید بھی طے نہ ہو پاتی۔

ہمیں اس صورتِ حالات سے جسقدر اطمینان ہے اس کے ساتھ ہی بعض باتیں ایسی بھی ظہور میں آ رہی ہیں جن سے ہمیں مستقبل میں کچھ خطرات نظر آتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایک وحدت کی اسکیم اس لئے قابلِ اطمینان اور موجبِ مسرت ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح سرحدی، پنجابی، سندھی اور بلوچی کی موجودہ تفریق ختم ہو کر پوری کی پوری ملت امتِ واحدہ بن جائیگی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض شقیں ایسی رکھی جا رہی ہیں جو اس اہم مقصد کی راہ میں روڑے اٹکا اور کانٹے بکھیر دیں گی۔ مثلاً پہلی شق یہ ہے کہ اس نو تخلیق صوبہ کی پارلیمان میں اسّی فی صدی نیابت پنجاب کی ہوگی اور اتنی دوسرے صوبوں کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم نے پنجاب اور سندھ، سرحد اور بلوچستان کی غیر فطری لکیروں ہی کو مٹا دیا تو پھر اس نیابت کیلئے ان لکیروں کو علیٰ حالہ قائم رکھنا چہ معنی دارد؟ اسی طرح ملازمتوں کے متعلق فیصلہ ہوا ہے کہ ان میں بھی پنجاب، سرحد، سندھ وغیرہ کا فی صدی تناسب علیٰ حالہ قائم رہے گا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب ۱۹۴۸ء میں حکومتِ پاکستان نے ملازمتوں میں صوبائی تناسب کے اصول کا اعلان کیا ہے تو ہم نے لکھا تھا اور اس کے بعد ہم اس تلخ حقیقت کو بار بار دہراتے رہے ہیں کہ تفریقِ ملت کا یہ وہ زہریلا بیج ہے جس سے انتشار کا شجرۂ الزقوم اگے گا اور ایک دن یہ قوم اس طرح ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جائیگی کہ پھر ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کا جوڑنا محال ہو جائے گا۔ ہم نے اس سات سال میں دیکھ لیا ہے کہ اس شجرِ ملعونہ کو کس قسم کے پھل لگے اور قوم کیا سے کیا ہو گئی۔ لیکن ہم اس سے بھی تجربہ حاصل نہیں کر رہے اور مغربی پاکستان میں صوبوں کے وجود کو عملاً مٹا دینے کے بعد بھی ان کے اس زہریلے اثر کو بدستور باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب آپ کہیں گے کہ فلاں اسامی ایک پنجابی کے لئے مخصوص ہے تو اگرچہ مغربی پاکستان کے نقشہ پر پنجاب کا الگ خطہ دکھائی نہ دیگا لیکن وہ ذہنیت جو اس طرح ایک پنجابی کو سرحدی اور سندھی سے الگ کرتی ہے بدستور موجود رہے گی۔ یہیں تک نہیں بلکہ اس مخصوص اسامی کے امیدوار کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ پنجابی ہے سندھی یا سرحدی نہیں ہے۔ آپ سوچئے کہ ان امتیازات کو اس طرح قائم رکھنے کے بعد یہ سمجھنا کہ ہم موجودہ صوبائی تفریق کو مٹا کر پوری قوم کو ایک ملت کے قالب میں ڈھال لیں گے کسقدر خود فریبی ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ کانٹوں میں الجھے ہوئے دامن کو جھٹکا دیکر نہیں چھڑانا چاہئے۔ اس سے خود دامن کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہم میں ایسے عناصر

کی کمی نہیں جنھیں مغربی پاکستان کی یہ وحدت بڑی ناگوار گذری ہے۔ ان عناصر کی تخریبی کارروائیوں کو غیر موثر کرنے کیلئے مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ انھیں علاقائی مفاد کے تحفظ کا یقین دلا دیا جائے۔ وہ صوبجاتی نیابت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسی مصلحت کا نتیجہ ہے لیکن بایں ہمہ ہمارے نزدیک اس کیلئے دس سال کا عرصہ بہت لمبا ہے اتنے طویل عرصہ تک صوبجاتی ذہنیت کو برقرار رکھنا وحدتِ ملت کے یکسر منافی ہو جائے گا اور تخریبی عناصر کو یہ موقع ملجائیگا کہ وہ اگلی پکڑتے پکڑتے پہونچے تک جا پہنچیں۔ یعنی وہ ملازمتی تناسب کی آڑ میں اس افتراقی ذہنیت کو اس قدر ہوا دیتے رہیں کہ ایک دن (خدانہ کردہ) ان صوبوں کی پھر سے علیحدگی کے مطالبہ کا شعلہ بھڑک اٹھے۔ ہمارے نزدیک کہیں بہتر ہوتا کہ ملک کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے بعد ان علاقوں کو خاص مراعات دیدی جاتیں جو اسوقت تعلیم میں پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان خطوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے پر خاص توجہ دی جاتی۔ ہم گورنر جنرل کی متعین کردہ کونسل سے درخواست کرینگے کہ وہ اس مسئلہ پر نظر ثانی کرے۔

ہماری تجویز یہ بھی ہے کہ کمشنریاں بناتے وقت کوشش یہ کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ کمشنریاں مخلوط علاقوں پر مشتمل ہوں۔ مثلاً پنجاب اور صوبہ سرحد کی کمشنریاں اس طرح بنائی جائیں کہ ایک کمشنری میں کچھ حصہ موجودہ پنجاب کا اور کچھ حصہ موجودہ سرحد کا آجائے اس طرح چند علاقوں کے سوا (جن میں مخلوط قسم کی کمشنریاں بنانا ممکن نہ ہوگا) باقی علاقے مخلوط ہو جائیں گے۔ اور یہ چیز موجودہ تفرق سے وحدت کی طرف ایک اور قدم ہوگا۔

مغربی پاکستان کی وحدت کے بعد سب سے اہم مسئلہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باہمی تعلقات کا ہے جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں ہمارے نزدیک (بحالاتِ موجودہ) اس مسئلہ کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دونوں علاقوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختار قرار دیکر مشترکہ مسائل مثل دفاع، سکہ، امور خارجہ وغیرہ کو کانفیڈریسی کی شکل میں مرکز میں رکھ لیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ انتظام بھی زیادہ آسان اور عملاً سہولت بخش رہیگا کہ مشرقی اور مغربی دونوں بازو مرکز کے اخراجات کیلئے سالانہ رقوم دیدیا کریں اور مرکز کو وصولی (REVENUE) کے جھمیلوں سے فارغ کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک پاکستان کیلئے کسی مرکزی پارلیمان کی بھی ضرورت نہیں۔ بہتر شکل یہ ہوگی کہ گورنر جنرل مشرقی اور مغربی پارلیمان سے اپنی صوابدید کے مطابق کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کرلیں جو ان کی مجلس مشاورت کی حیثیت سے انکے ساتھ رہیں۔ ملک کے مشترکہ مفاد کے امور گورنر جنرل ان مشیروں کے مشورہ سے طے کر دیا کریں اور اس کی کابینہ ان طے شدہ امور کے نفاذ کی ذمہ دار ہو۔

اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد بھی وہ فتنہ اپنی جگہ پر بدستور موجود ہے جو پاکستان کی تباہیوں کا بنیادی موجب ہے۔ یہ فتنہ ہے ملک میں مختلف پارٹیوں کا وجود۔ ہم اسلام اسلام رٹنے کے باوجود مغرب کی جن لعنتوں کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں ان میں ایک بڑی لعنت پارٹی سسٹم ہے۔ اس لعنت کو ہم کس درجہ ناگزیر سمجھتے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے اسلام اسلام پکارنے والے ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ

> جمہوری انداز کی حکومت صرف مختلف پارٹیوں کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے۔ سیاسی پارٹیاں جمہوریت کی مشینری کے پرزے ہیں اور اگر یہ پارٹیاں کسی ایک پارٹی کے استبداد یا رائے عامہ کے فقدان کی وجہ سے نشو و نما نہیں پاتیں تو سمجھ لیجئے کہ جمہوریت کے دعاوی سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

یعنی ان حضرات کے نزدیک

(۱) اسلام کا منشاء جمہوریت ہے۔ (یعنی مغربی انداز کی جمہوریت)

(۲) جمہوریت کا تقاضا ہے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں موجود رہیں۔

(۳) لہٰذا اسلامی نظام کے لئے مختلف پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہے۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ جب ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں سے جواب یہ ملتا ہے کہ فرعون کی سب سے بڑی ابلیسی حکمت یہ تھی کہ وہ ملک کو پارٹیوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔ اسلام کے خدا نے ملت میں مختلف پارٹیوں کے وجود کو (خواہ وہ مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں) اپنا غضب اور لعنت قرار دیا ہے اور اسے شرک ٹھہرا دیا ہے جب تک ہماری حالت یہ رہیگی کہ ہمارے لبوں پر اسلام رہیگا اور دلوں میں مغربی معاشرت اور نظام کا تقدس اور عظمت، ہم اسلام کے قریب کبھی نہیں آسکیں گے طلوع اسلام نے اپنی پہلی اشاعت (جنوری ۱۹۴۸ء) میں کہا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسے مٹا دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ملک میں باقی پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی اور ملک کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے مسلم لیگ اپنے اعمال کی بدولت اپنی موت آپ ہی مر رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اب اس ممی شدہ لاش کو اپنے ہاتھوں دبا دیا جائے تو اچھا ہے ورنہ اسکی اور بھی بے حرمتی ہوگی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کو پارٹیوں کی لعنت سے قانوناً پاک کر دیا جائے۔ ملت اسلامیہ دنیا میں باطل کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے اندر اور پارٹیاں بنانا پارٹی کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سازش کو بالآخر کبتک روا رکھا جائے گا۔

اگلے دنوں حکومت کی طرف سے یہ اعلان بھی ہوا تھا کہ پاکستان کے آئین کا ایک ڈھانچہ مرتب کیا جائیگا اور اس آئینی ڈھانچہ کی بنیادوں پر نئے الیکشن لڑے جائیں گے۔ قوم میں عملاً وحدت فکر و نظر پیدا ہو جانے کے بعد تو اسکی بھی ضرورت نہیں رہے گی کہ اس قسم کے کسی مسئلہ کو الیکشن کی بنیاد قرار دیا جائے لیکن جن حالات سے ہم اسوقت گذر رہے ہیں ان کے پیش نظر یہ تجویز پارٹی بازی کے مقابلہ میں بہرحال بہتر ہے۔ ہم حکومت سے عرض کرینگے کہ وہ اس آئینی ڈھانچہ کو کہیں مسلم لیگ کا منشور نہ بنا دے اس سے پھر وہی پارٹی بازی کی سرپھٹول شروع ہو جائیگی۔ وہ مسلم لیگ سمیت ملک کی پارٹیوں کو ختم کر دے اور اس کے بعد اس آئینی ڈھانچہ کو شائع کر دے اور اس کا انتظام کرے کہ انتخابات پوری آزادی کے ساتھ عمل میں آئیں جو مجلس آئین ساز اس آئینی سکیم کی تائید سے وجود میں آئیگی اس کیلئے کام صرف اتنا رہ جائیگا کہ وہ ان اصولی خطوط کے اندر جزئیات کا رنگ بھر دے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس آئینی ڈھانچہ کی تدوین کا مسئلہ بھی کسقدر اہم ہے۔ زیر نظر پرچہ ماہنامہ طلوع اسلام کی آخری اشاعت ہے اس کے بعد اس کی جگہ ہفتہ وار طلوع اسلام شائع ہوگا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اس پہلے پرچہ میں آئینی ڈھانچہ بنانے والوں کو مخاطب کریں اور انھیں بتائیں کہ ایک اسلامی آئین کے خطوط کیا ہوتے ہیں اور اس باب میں سابقہ مجلس آئین ساز نے کیا کیا غلطیاں کیں تا کہ یہ حضرات بھی انہی غلطیوں کا اعادہ نہ کریں۔ ہم چاہتے تھے کہ ہفتہ وار طلوع اسلام جلد از جلد شائع ہو جائے لیکن ابھی تک حکومت کی طرف سے کاغذ کا پرمٹ نہیں مل سکا۔ جہانتک ہمارا اپنا تعلق ہے اس کے لئے سب انتظامات مکمل ہیں۔

واللہ المستعان

ہفتہ وار طلوعِ اسلام

ہماری کوشش یہ تھی کہ ہفتہ وار طلوع اسلام کا پہلا پرچہ یکم جنوری کو شائع ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ پہلے ہی اندیشہ تھا جو امور حکومت کے دفاتر سے متعلق ہیں، انھوں نے غیر معمولی وقت لے لیا اور بعض مراحل ابھی تک تکمیل تک نہیں پہنچ پائے۔ ان میں سب سے اہم سوال کاغذ کا پرمٹ ہے۔ چونکہ ہفتہ وار طلوع اسلام کا پہلا پرچہ یکم جنوری کو نہیں نکل سکتا تھا اس لئے یکم جنوری کو ماہانہ طلوع اسلام کا پرچہ پیش خدمت ہے۔ دسمبر کی اشاعت کے ساتھ طلوع اسلام نے اپنے کراچی کے دور کے سات سال پورے کر لئے۔ جنوری ۱۹۵۵ء کا یہ پرچہ اس کے آٹھویں سال کا پہلا قدم ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ جنوری کے اندر اندر ہفتہ وار طلوع اسلام کا پہلا پرچہ شائع ہو جائے گا۔ اس اعتبار سے ماہوار طلوع اسلام کا یہ آخری پرچہ ہوگا۔

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کی ایک جھلک

بعض حضرات نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ہفتہ وار طلوع اسلام زیادہ تر اخبار نما ہوگا اور اس میں طلوع اسلام کا موجودہ انداز باقی نہیں رہے گا۔ ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ ہفتہ وار طلوع اسلام اخبار نہیں ہوگا۔ موجودہ طلوع اسلام ہی کا تیز رفتار ایڈیشن ہوا کرے گا۔ اس میں موجودہ طلوع اسلام کے سارے انداز ہوں گے اور اس کے علاوہ بہت سے نئے ابواب کا بھی اضافہ ہوگا۔ مثلاً

(۱) **قرآن نے کیا کہا؟** یہ ایک مستقل عنوان ہوگا۔ لیکن کوشش کی جائے گی کہ اسے اور زیادہ عام فہم کر دیا جائے تاکہ کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے۔

(۲) **مجلسِ اقبال:** اس عنوان کے تحت علامہ اقبالؒ کے پیام کو قرآن کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ حضرت علامہ کی کسی ایک کتاب کو لے لیا جائے گا اور اس کی مسلسل تشریح کرتے چلے جائیں گے۔ اسی طرح پورے کا پورا اقبال، قرآن، تاریخ، فلسفہ اور سیاستِ حاضرہ کی روشنی میں سامنے آجائے گا۔

(۳) **تاریخی شہادتیں:** قرآن نے اپنے نظام اور قوانین کی صداقت میں اقوام سابقہ کے احوال و کوائف اور انبیاء گذشتہ کے تذکار جلیلہ کو بطور تاریخی شواہد پیش کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت ان شواہد کو مسلسل بیان کیا جائے گا۔ تا آنکہ یہ سلسلہ (حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہو کر) نبی اکرم صلعم کی ذاتِ گرامی تک آپہنچے۔

(۴) **اسلام کی سرگذشت:** یہ ایک مسلسل تاریخ ہوگی، لیکن مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی۔ جس میں بتایا جائیگا

کہ رسول اللہ صلعم کے عہد ہمایوں سے لیکر اس وقت تک اسلام کن مراحل میں سے گذرا ہے اور کیا سے کیا بنتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔

(۵) **عصرِ حاضر**: اس کے چار حصے ہوں گے۔ اقوامِ مغرب[۱]، جملہ ممالکِ اسلامیہ[۲]، ہندوستان[۳] کے مسلمان، اور پاکستان[۴]۔ ان تمام ممالک کے اہم وقائع اور ماجریات پر تبصرہ اور وہاں کی فکری، تمدنی اور سیاسی تحریکات کا تنقیدی تعارف ہوگا۔

(۶) **طالب علموں کے لئے**: سلیم کے نام خطوط کا جو سلسلہ اس وقت تک چلا آرہا ہے اور جو قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں بے حد مقبول ہوا ہے وہ علیٰ حالہٖ جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ ملک کے تعلیمی مسائل کی طرف خاص توجہ دی جائے گی اور طالب علموں کی مشکلات کا حل سوچا جائے گا۔

(۷) **عورتوں کے لئے**: طاہرہ کے نام خطوط کا جو سلسلہ چلا آرہا ہے اور جس نے قوم کی بچیوں کی ذہنیت کو خالص قرآنی خطوط پر ڈھالنا شروع کر دیا ہے، علیٰ حالہٖ جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ اس عنوان کے تحت یہ بتایا جائے گا کہ جب ایک عورت قرآن کو پڑھتی ہے تو وہ اس کے اندر اپنے متعلق کیا کچھ لکھا ہوا پاتی ہے۔ یہ سلسلہ عورتوں کے لئے بڑا مفید اور دلچسپ ہوگا۔

(۸) **عوام کے لئے**: عوام زیادہ تر یہ چاہتے ہیں کہ انھیں معلوم ہو کہ روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں۔ ان کی طرف سے جو استفسارات موصول ہوتے ہیں۔ ان کے جوابات اس وقت باب المراسلات کے ماتحت شائع ہوتے ہیں اس سلسلہ کو اور وسیع کیا جائے گا اور زندگی کے تمام معاملات کے متعلق قرآن کے احکام بالالتزام پیش کئے جائیں گے۔ اس حصہ کی زبان ایسی عام فہم رکھی جائے گی کہ اس سے بچے بھی فائدہ حاصل کر سکیں۔

(۹) ان کے علاوہ لمعات اور حقائق وغیرہ وغیرہ بھی اسی انداز کے رہیں گے۔ نیز اہم عنوانات پر تحقیقاتی مضامین کیلئے بھی گنجائش رکھی جائے گی۔

یہ ہیں وہ موٹے موٹے عنوانات جو سرِدست ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اس کے بعد جوں جوں مزید تقاضے ہمارے سامنے آتے جائیں گے ان میں اضافہ بھی ہوتا جائے گا اور ردوبدل بھی۔

پہلے پرچہ میں

عنوانات بالا کے علاوہ ہفتہ وار طلوع اسلام کے پہلے پرچہ میں ہم ان حضرات کو خاص طور پر مخاطب کریں گے جن کے ذمہ اب پاکستان کی آئین سازی کا کام لگایا جانیوالا ہے۔ انھیں بتایا جائے گا کہ سابقہ مجلسِ آئین ساز نے کیا کیا غلطیاں کیں اور انھیں کن کن گڑھوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

السابقون الاولون

ہم نے پچھلے پرچہ میں لکھا تھا کہ جن حضرات نے محض اپنے خلوص کی بنا پر ہفتہ وار طلوع اسلام کے سلسلہ میں اپنی امداد پیش کی ہے۔ طلوع اسلام عمر بھر کے لئے ان سے رابطہ قائم رکھے گا اور پرچہ ان کی خدمت میں بلا قیمت حاضر ہوتا رہیگا ہماری یہ پیشکش ان حضرات کے لئے تھی جو اس اعلان سے پہلے امداد کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس ضمن میں بعض دردمند حضرات نے لکھا ہے کہ طلوع اسلام جو پہلے ہی سے ایسی مالی دشواریوں میں مبتلا ہے اسے ایسی سخاوتوں پر نہیں اتر آنا چاہیئے تھا۔ ان کے نزدیک ہماری یہ پیشکش ایک گونہ اسراف پر مبنی تھی۔ ہم اپنے ان مخلص دوستوں کی اس شکایت رنگین کی قدر کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اتنا عرض کرنے کی اجازت ضرور چاہتے ہیں کہ وَاِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوهَا (۴/۸۶) بھی قرآن ہی کا حکم ہے۔ وہ یقین مانیں کہ اس سے اسراف نہیں ہوگا بلکہ یہ حضرات بہترین رفقائے سفر ثابت ہوں گے۔ پھر ان میں سے بکثرت ایسے حضرات بھی تو ہیں جو ہماری اس پیشکش کے باوجود طلوع اسلام کو بلا قیمت لینا پسند نہیں کرتے۔

خریداران سے

دفتر کی طرف سے طلوع اسلام کے ہر ایک خریدار کو حساب کا کارڈ الگ الگ بھیجا جا چکا ہے۔ اس حساب میں جنوری ۱۹۵۵ء کے ماہانہ طلوع اسلام کی قیمت بھی شامل کر لی گئی ہے۔ ان میں سے جن حضرات کا تفی میں جواب نہیں آیا ان کی خدمت میں بقایا رقم کے لئے ہفتہ وار طلوع اسلام کا کوئی پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔

انگریزی طلوع اسلام

طلوع اسلام کے انگریزی ایڈیشن کے تقاضے بڑھ رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم سردست تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہفتہ وار طلوع اسلام (اردو) کے تھوڑے سے تجربے کے بعد حالات زیادہ صاف ہو جائیں گے۔ ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ حضرات نے اس کی توسیع اشاعت اور بالخصوص اس کیلئے اشتہارات حاصل کرنے میں خاص کوشش فرمائی تو ہمارے اگلے مراحل زیادہ آسان ہو جائیں گے۔

اچھا خدا حافظ۔ اب انشاء اللہ ہفتہ وار طلوع اسلام کے پہلے پرچہ میں ملاقات ہو گی۔ غالب نے ایسے ہی وقت کیلئے کہا تھا کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

والسلام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

کراچی

معارف القرآن

کی چار جلدیں شایع ہو چکی ہیں لیکن ان میں پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جناب پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے، چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے۔

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریہ ارتقاء) قصہ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی اور رسالت سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم اور جناب پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہوگی!

یہ کتاب بڑی تقطیع (۲۲×۲۹/۸) کے ۳۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور روانگی شروع ہو رہی ہے۔ جس ترتیب سے فرمائشیں آئی تھیں اسی ترتیب سے اس کی روانگی ہو رہی ہے جن حضرات نے ابتک آرڈر نہیں دیا وہ اپنی فرمائش بہت جلد بھیجدیں جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان کو کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جن حضرات نے منع نہیں فرمایا ہے ان سب کو کتاب ازخود بھیجی جارہی ہے۔ **قیمت مجلد مع گردپوش آٹھ روپے۔** (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

طاہرہ کے نام

(بچے کی تربیت)

تم بھی کسقدر بھولی ہو طاہرہ! تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے کہ سعیدہ بیس برس کی ہونے کو آئی اور اب بھی بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ یعنی تم نے یہ تصور کر رکھا ہے کہ جس طرح عمر کے ساتھ ساتھ بچے کا جسم بڑھتا ہے اسی طرح اس کے ذہن[1] میں بھی پختگی آتی جاتی ہے۔ یہ خیال یکسر غلط اور واقعات کے خلاف ہے۔ اگر جسمانی قویٰ کے ساتھ ساتھ ذہن میں بھی از خود پختگی آتی جائے تو ہمارے معاشرے کا رنگ ہی کچھ اور ہو جائے۔ تمہیں جسقدر مصیبتیں دنیا میں نظر آتی ہیں ان کا بیشتر حصہ اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کے جسم تو جوان ہو جاتے ہیں لیکن ذہن بدستور بچوں کا سا رہتا ہے۔ اگر ذہن کے ساتھ جسم بھی بچوں جیسا رہے تو پھر بھی خیریت رہے۔ اس لئے کہ جہاں بچے کا ذہن ناپختہ ہوتا ہے وہاں اس کی جسمانی قوت اور اختیار کی وسعت بھی بہت محدود ہوتی ہے۔ اسلئے وہ زیادہ خون خرابے کا موجب نہیں بنتا۔ لیکن ذرا سوچو کہ جب جسم میں جوان آدمی کی قوت آجائے اور ہم اسے بالغ سمجھ کر اختیارات بھی سارے سونپ دیں لیکن ذہن (MIND) اس کا رہے بچوں جیسا ناپختہ۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلیگا؟ وہی جو تم نے (FRANKINSTINE) کی پکچر میں دیکھا تھا۔ ایک دیو کے جسم میں پاگل کا دماغ!۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسے تو ہر شخص پاگل سمجھتا تھا لیکن ناپختہ ذہن کے جوان آدمی کو کوئی پاگل نہیں سمجھتا۔ اسے صاحب عقل و ہوش سمجھا جاتا ہے۔ اسی تصور کے مطابق اس کے سپرد بڑی بڑی ذمہ داریاں کر دی جاتی ہیں۔ اور جب اس کے بعد اس سے بچوں کی سی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں تو ہم جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ یہ جھنجھلانا ہمارے خرمنِ امن و سکون میں گویا پہلی چنگاری ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ اختلاف تنازعہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تنازعہ بڑھ کر فساد بن جاتا ہے۔ وہ جوان جسم کا بچہ، نہ اپنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہے اور نہ اپنی روش بدلتا۔ روش کا بدلنا درحقیقت اس کے اختیار میں ہی نہیں ہوتا۔ اگر ہم نے اسے ایسے اختیارات دے رکھے ہوں جنھیں ہم آسانی سے واپس نہ لے سکیں تو ہماری بے بسی، زہر بن کر ہمارے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ ہم اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ اگر اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس بھی قوت ہوتی ہے تو پھر دونوں قوتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے معاشرے میں جہنم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی شعلے آگے بڑھ کر عالمگیر جنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ آئے دن کے لڑائی جھگڑے۔ یہ سر پھٹول۔ یہ خون خرابے۔ یہ وحشت اور درندگی کے مظاہرے۔ یہ سب کیا ہیں! اسی اصل کی شاخیں کہ جسم جوان ہو جاتے ہیں اور ذہن بچوں کا سا ناپختہ رہتا ہے۔ اگر بچے کو مناسب غذا ملتی جائے تو اس کا جسم خود بخود بڑھتا جاتا ہے۔ ہماری

---

[1] اس خط میں ذہن یا ذہنیت سے مراد (MIND) ہے اور پختگی کا لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس میں (MATURE) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پختہ ذہن سے مراد ہوگا (MATURE MIND) اور ناپختہ سے (IMMATURE)۔

بھول یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں پختگی بھی از خود آجاتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ ذہن میں پختگی پیدا کرنے کے لئے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لئے تعلیم و تربیت کے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ یہ وجہ ہے طاہرہ بیٹی جو میں تمہیں بار بار کہتا رہتا ہوں (اور کبھی کبھی اسے محسوس بھی کرتا ہوں کہ کہیں میرا اس طرح برابر کہتے رہنا تمہیں ناگوار ہی نہ گذرے۔ لیکن یہ بات ہی ایسی ہے کہ اس کے باوجود میں تمہیں برابر کہتا رہوں گا کہ) تم جاوید میاں (اللہ اسے ہر آفت سے محفوظ رکھے) کی جسم کی پرورش کی طرف تو اس قدر توجہ دیتی ہو لیکن اس کے ذہن کی تربیت کیلئے کچھ نہیں کرتیں۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گی کہ میں اسے بدتمیز بچوں کے پاس بیٹھنے نہیں دیتی۔ بری عادتوں والے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس سے اس میں بری عادتیں پیدا نہیں ہونگی۔ لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ جس بچے میں بری عادتیں پیدا نہ ہوں اس میں اچھی عادتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ تم زبان سے ایسا کہو یا نہ کہو، غیر شعوری طور پر تمہارے دل میں بھی یہی خیال جاگزیں ہے کہ بچے کو اگر بری باتوں سے محفوظ رکھا جائے تو اس کے دل و دماغ کی تعمیر "فطرت" کے عین مطابق ہوتی جائے گی اور وہ اس طرح دنیا بھر کی خوبیوں اور بھلائیوں کا پیکر بن جائے گا۔ یہ خیال غلط ہے۔ "فطرت" کے متعلق میں سلیم میاں کے ایک خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں[1]۔ غالباً تم نے وہ خط دیکھا ہوگا۔ لیکن اس میں بات کچھ فلسفیانہ سی تھی اس لئے شاید تم اچھی طرح نہ سمجھ سکی ہو۔ اس لئے تم اسی بات کو ایک اور انداز سے سمجھو۔ تم نے بچوں کو دیکھا ہے۔ (اور جاوید میاں کی تو ایک ایک نقل و حرکت تمہاری آنکھوں کے آئینے میں عکس اور دل کی لوح پر نقش ہے)۔ تم غور کرو کہ جب یہ (پیدا ہونے کے بعد) ہنوز خارجی اثرات سے محفوظ تھا تو اس کی "فطرت" کیا تھی؟ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ بالکل جاہل تھا۔ اسے علم تھا تو اتنا ہی جتنا (مثلاً) بکری کے بچے کو ہوتا ہے۔ بھوک لگی تو دودھ پی لیا اس کے بعد سو گئے۔ دودھ ملنے میں ذرا دیر ہوئی تو لگے میمانے۔ اس سے ذرا آگے بڑھے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت آئی تو بکری کے بچے جتنا بھی علم نہ رہا۔ بکری کا بچہ بھوک سے مر رہا ہو اور اس کے پاس ہی سبز مرچوں کا ڈھیر لگ رہا ہو۔ کیا مجال جو وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ جائے۔ لیکن انسان کے بچے کی یہ حالت ہے کہ مرچ ہاتھ میں آئی تو وہ منہ میں۔ نمک کی ڈلی اٹھائی تو وہ منہ میں۔ مٹی۔ راکھ۔ چونا۔ کوئلہ۔ الا بلا جو ہاتھ میں آیا جھٹ منہ میں۔ تمہیں یاد ہے کہ جاوید میاں جب پیسہ نگل گئے ہیں تو وہ خود، اور ہم سب کس مصیبت میں پھنس گئے تھے! کبھی تم نے بکری کے بچے کو بھی پیسہ نگلتے دیکھا ہے؟ جب یہ ذرا گھٹنوں چلنے لگے ہیں تو اور پریشانی بڑھی تھی۔ وہ آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہاں سے بچایا تو پانی کے ٹب میں جا گرے۔ وہ تو یوں کہو کہ اللہ کو ان کی زندگی اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک منظور تھی جو رانی کی نظر پڑ گئی ورنہ . . . . . (میں بیٹا! گئی بات کا ہیکو زبان پر لاؤں، اللہ ہر صاحب اولاد کو ایسی انہونی آفتوں سے محفوظ رکھے)۔ اس سے ذرا آگے بڑھے اور چلنا پھرنا، بھاگنا دوڑنا سیکھا تو اور آفت آئی۔ کبھی خود کوٹھے سے گرے۔ کبھی ساتھی کو دھکا دیکر گرا دیا۔ جو چیز ہاتھ میں آئی اسے اٹھا پھینکا۔ یہ پرچ ٹوٹی۔ وہ پیالی گرائی۔ جو چیز دوسرے کے ہاتھ میں دیکھی اس سے جا چھینی۔ اس نے نہ دینا چاہی تو کسی کو دانت کاٹا۔ کسی کو ناخنوں سے لہولہان کر دیا۔ اس مہترانی کے لڑکے کی تو آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی تھی۔ توڑنا پھوڑنا۔ چھیننا جھپٹنا۔ مارنا پیٹنا۔ یہ ہوتی ہے بچے کی "فطرت" جسے وہ کسی سے سیکھتا نہیں بلکہ جو

---

[1] دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" میں سترہواں خط۔

اس کے اندر سے از خود پیدا ہوتی ہے۔ نفسیاتی طور پر دیکھو تو بچہ بڑا حاسد ہوتا ہے۔ یہ جو تم ہر خط میں لکھتی ہو کہ جاوید، ننھی بچاری کو بری طرح سے پیٹتا رہتا ہے تو اس کی وجہ بھی وہی حسد کا جذبہ ہے۔ ننھی کی پیدائش سے پہلے، سب کا پیار اکیلے جاوید میاں کے لئے تھا۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔ ننھی آئی تو انھوں نے اسے اپنی "مملکت" میں شریک تصور کر لیا۔ اب یہ ہر وقت اس بچاری کو اس سے نکالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ بچہ ہر ایک کی توجہ کا واحد مرکز بننا چاہتا ہے۔ وہ (SELF – CENTRED) رہنا چاہتا ہے۔ اب ننھی ذرا بڑی ہوگی تو تم دیکھو گی کہ وہ عام طور پر بیمار رہا کرے گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوگا! وہ جاوید کا مقابلہ طاقت سے تو نہیں کر سکے گی اسلئے وہ کمزور اور بیمار رہ کر سب کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیگی۔ وہی (SELF-CENTRED) ہونے کا جذبہ! یہ ہے طاہرہ بیٹی! نقشہ اس انسانی بچے کا جسے خارجی اثرات سے محفوظ رکھکر اس کی اپنی افتاد پر چھوڑ دیا جائے۔ تم کہتی ہو کہ تم بڑی احتیاط کرتی ہو کہ جاوید میاں بدتمیز بچوں کے ساتھ کھیلے نہیں تاکہ اس میں بری عادتیں نہ پیدا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم اس کی پرورش تھرماس (THERMOS) کے اندر رکھ کر کرو تو بھی اس میں وہ عادتیں ابھریں گی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے؟ کیا یہی عادتیں کچھ کم بری ہیں! اب تم سوچو کہ اگر بچوں کو (بقول تمہارے) بری عادتوں سے بچا بھی لیا جائے اور وہ مذکورہ بالا ذہنیت کو لیکر جوان ہو جائیں تو معاشرے میں اس قسم کے نوجوان کس قسم کے افراد بنیں گے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ان کیلئے مجرم (CRIMINAL) کے علاوہ اور کونسا لفظ موزوں ہو سکتا ہے! یہ ہیں بیٹی! وہ افراد جن پر ہمارا معاشرہ بالعموم مشتمل ہے۔ وہ نوجوان (خواہ مرد ہوں خواہ عورتیں) کہ عمر نے جن کے جسموں کو بڑا کر دیا ہے لیکن جن کے اندر ذہنیت (MIND) بچوں کی سی ہے۔ انہی میں سے کچھ اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتے ہیں کچھ مذہبی مسندوں پر براجمان۔ کچھ تجارت کی منڈیوں کو سنبھال لیتے ہیں کچھ صنعت و حرفت کے مرکزوں کو۔ کچھ آئین بنانے والے بن جاتے ہیں کچھ قانون کو چلانے والے۔ کچھ آنیوالی نسلوں کے معلم بن جاتے ہیں۔ کچھ جانے والوں کے مدح خواں۔ انہی کو دنیا مشاہیر اور ابطال سمجھنے لگ جاتی ہے حالانکہ یہ عام طور پر "پیر نابالغ" ہوتے ہیں۔ پختہ جسم کے اندر پختہ ذہن (MATURE MIND) بہت کم دیکھنے میں آئیگا۔

تم کہو گی کہ ہم ان بچوں کو علیٰ حالہٖ نہیں چھوڑتے۔ انھیں تعلیم بھی دیتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کہ ہم انھیں تعلیم کس قسم کی دیتے ہیں؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ بچے کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم اسے مدرسے بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس عمر تک تو بچہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ جاوید میاں وہی زبان بولتے ہیں جو تمہارے گھر میں بولی جاتی ہے اور تمہارے پڑوس کا بچہ وہ زبان بولتا ہے جو ان کے گھر میں بولی جاتی ہے۔ تم نے کبھی جاوید کو تختی کتاب دیکر اردو سکھانے کیلئے نہیں بٹھایا۔ وہ تمہاری (اردو) زبان کو بغیر سکھائے سیکھ گیا ہے۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ جس دوران میں وہ بغیر سکھائے، چپکے ہی چپکے اردو بولنا سیکھ رہا تھا، اسوقت اور کچھ نہیں سیکھ رہا تھا؟ وہ چپکے ہی چپکے ان تمام باتوں کو سیکھ رہا تھا جو تمہارے ہاں دن رات ہو رہی تھیں۔ یہ تھی وہ تعلیم جسے وہ مدرسے جانے سے پہلے حاصل کر چکا تھا۔ اور اس تعلیم کا سب سے بڑا حصہ ان امور پر مشتمل تھا جسے اخلاقیات اور معتقدات کہا جاتا ہے۔ حیوانات میں اخلاقی ضابطہ (MORAL LAW) نہیں ہوتا۔ یہ امتیاز صرف انسان کو حاصل ہے۔ لیکن ذرا سوچو طاہرہ! کہ اس اتنے بڑے امتیاز کی بنیاد کیا ہے؟ وہ تعلیم جسے بچہ چپکے ہی چپکے گھر کے اندر اخذ کر لیتا ہے۔ (جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی ایک خط میں لکھا تھا)

ایک جینی کے بچے کو گوشت کے تصور سے متلی ہو جاتی ہے اور مسلمان بچہ ہڈی کو شیر مادر کی طرح چوستا ہے۔ ایک ہندو کو گائے کے گوشت کے نام سے جھرجھری آجاتی ہے لیکن مسلمان کے نزدیک اس سے زیادہ لذیذ کباب اور کسی گوشت کا نہیں ہوتا۔ ہمارے گھروں میں بچے چیونٹی مارنے کو بھی گناہ سمجھتے ہیں لیکن ٹھگوں کا بچہ بڑی بے تکلفی سے انسانی جان لے لیتا ہے۔ یہ ہے بنیادی تعلیم جسے حاصل کرنے کے بعد بچہ اسکول جاتا ہے۔ اُن اسکولوں میں تعلیم کس قسم کی ملتی ہے اس کا اندازہ لگانے سے پہلے تم ذرا اپنے پچھلے خط کو سامنے لاؤ جس میں تم نے لکھا تھا کہ جاوید میاں کی غذا کا اسقدر خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس پر بھی اس کے جسم میں خون اور توانائی پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے تمہیں لکھا تھا کہ تم اسے کھانے کو تو سب کچھ دیتی ہو لیکن کبھی اس کا جائزہ بھی لیتی ہو کہ یہ کھانا پیٹ میں پہنچکر ہضم ہوتا اور جزو بدن بھی بنتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ جزو بدن نہیں بنتا تو ایسے کھانے سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ یہی حالت ہماری تعلیم کی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں بچے کے ذہن میں بہت سی معلومات (INFORMATION) تو ٹھونس دی جاتی ہے لیکن اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا کہ بچہ ان معلومات کو اپنے کیریکٹر کا جزو بنانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ ہماری تعلیم سیرت سازی نہیں سکھاتی۔ صرف معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کا نقشہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ عمر کے لحاظ سے قد اور جسم پورا۔ اس میں ذہنیت بچے کی اور پشت پر معلومات کا پنڈارا۔ اب ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کا نوجوان جس طرح اپنی دولت، قوت، اختیارات کو بچوں کی طرح استعمال کریگا اسی طرح معلومات کے اس ذخیرے کا بھی استعمال کرے گا جسے اسکولوں اور کالجوں میں اس کی پشت پر لاد دیا گیا ہے۔ اب تم اس نوجوان کا تجزیہ کرو تو اس کے اجزائے ترکیبی یہ ملیں گے۔

(۱) عمر کے لحاظ سے بالغ لہٰذا ہر قسم کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل۔

(۲) ذہنیت کے اعتبار سے بچہ جو ذمہ داری کے لفظ تک سے ناواقف ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم کے لحاظ سے اسٹیشن کا قلی جو ایسے سامان کو اٹھائے لئے جاتا ہے جس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ اس کا حصہ صرف وہ مزدوری ہے جو اسے اس سامان کی حمالی میں ملے گی۔ اور

(۴) عقائد و تصورات وہ جو اس نے اپنے گھر کے ماحول میں غیر شعوری طور پر اخذ کئے تھے اور جن کی تائید میں اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں۔ ایسے عقائد، فائدہ مند ہونے کے بجائے الٹا نقصان رساں ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ یہ عقائد نہ اس کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتے اور نہ ذہن کی روشنی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ غیر شعوری طور پر ان سے وابستہ رہتا ہے اور جونہی اس کے سامنے ایسے دلائل یا زندگی کے تقاضے آتے ہیں جن پر وہ عقائد پورے نہیں اترتے تو یہ اس لبادے کو جھٹ سے اتار پھینکتا ہے اور پھر ان کے خلاف اس کے دل میں نفرت اور بغاوت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس میں اتنی جرأت نہ ہو کہ اس بغاوت کا اظہار علانیہ کر دے تو اس کا سینہ منافقت کی آتشِ خاموش کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ جس کے تباہ کن نتائج بڑے دور رس ہوتے ہیں۔

اب تم نے سمجھا طاہرہ! کہ بچے والی ماں پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن ان ذمہ داریوں کو وہ مائیں کیا سمجھ سکیں گی جنہوں نے بچے کی غذا کے لئے گلیکسو کا ڈبہ منگا لیا۔ تربیت کے لئے جاہل آیا ملازم رکھ لی اور تعلیم کے لئے نرسری اسکول میں بھیج دیا اور خود یہ

کہہ کر کلبوں میں گھومنا شروع کر دیا کہ کیا کیا جائے بیکار وقت ہی نہیں کٹتا۔ یا (جدید فیشن کے مطابق) کسی اصلاح معاشرہ کی انجمن (SOCIAL WELFARE SOCIETY) کی ممبر بن گئیں اور قوم کی اخلاقی پستی پر لیکچر دینے شروع کر دیئے۔ ایک فرض شناس ماں کے لئے تو ایک بچے کی پرورش، تعلیم اور تربیت کا کام اسقدر ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی دوسری طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ فطری تقسیم کار کی رو سے اکتسابِ رزق مرد کے ذمہ ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ دیکھے کہ بیوی کی تمام ضروریات پوری ہو رہی ہیں، تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ عورت کو اپاہج بنا کر مرد کا معاشی غلام بنانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ اسلئے کیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک فرض شناس ماں کو اکتسابِ رزق کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ لہٰذا بیٹی! تمہیں ہر روز یہ دیکھنا ہوگا کہ جس رفتار سے بچے کے جسم کی پرورش ہو رہی ہے اور اس کا قد اور اعضا بڑھ رہے ہیں، اسی رفتار سے اس کا ذہن (MIND) پختہ (MATURE) ہوتا جا رہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو سمجھ لو کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے لئے مصیبت اور معاشرہ کے لئے وبال جان بن جائیگا۔ یاد رکھو انسانی بچہ میں صلاحیتیں ان گنت ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں ہوتی۔ اگر ہم ساری عمر ان کی نشوونما کرتے رہیں تو وہ آگے ہی آگے بڑھتی جائیں گی۔ اب تم سوچو کہ جس بچے کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں، کیا معلوم انسانیت اس کے کس قدر بیش بہا جوہروں سے محروم رہ جائیگی!

اب تم یہ پوچھو گی کہ یہ کس طرح سے معلوم ہو سکے کہ فلاں مرد (یا عورت) کی ذہنیت ناپختہ رہ گئی ہے؟ یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں۔

(۱) جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ کسی معاملہ کو اس طرح حل کر رہا ہے جس طرح بچے معاملات (PROBLEMS) کو حل کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس کے بالغ جسم میں ذہن بچے کا ہے۔ اگر تم اس نگاہ سے جائزہ لو گی تو تمہیں نظر آجائے گا کہ جنہیں تم پختہ عمر کے مرد یا عورتیں سمجھتی تھیں وہ درحقیقت بچے ہیں۔ یہی ہیں وہ "بچے" جو معاشرہ کی بیشتر مصیبتوں کا موجب ہوتے ہیں۔

(۲) اگر تم کسی مرد یا عورت کو دیکھو کہ اسے عمر کے کسی حصہ میں یہ اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ میں نے کافی علم حاصل کر لیا ہے اور اب مجھے مزید علم کی ضرورت نہیں تو سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچہ ہے۔ بچہ ہر اسٹیج پر سمجھتا ہے کہ اس کا علم کامل ہے۔

(۳) بچہ قانون سے واقف نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کا پابند رہنا چاہتا ہے۔ قانون کے معنی عدالت کا قانون نہیں۔ اس کے معنی ہیں یہ اصول کہ ہر کام کا ایک خاص نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے کہتے ہیں (WHAT-FOLLOWS-WHAT.) دین کی اصطلاح میں اسے قانونِ مکافات کہا جاتا ہے۔ دنیا میں صحیح نتائج تک پہنچنے کا یہی طریق ہے۔ اسے عرف عام میں سائنٹفک طریق کہتے ہیں۔ بچہ اس طریق سے واقف نہیں ہوتا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اسکی باتوں میں منطقی تسلسل (LOGICAL SEQUENCE) ہوتا ہے اور نہ اس کے کاموں میں ربط و التزام۔ یہی چیز جب تم کسی بڑے میں دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ صرف (غیر اختیاری طور پر) عمر میں بڑھ گیا ہے ورنہ ذہن کے اعتبار سے وہیں کا وہیں ہے۔

(۴) انسان کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ (RATIONAL ANIMAL) ہے۔ (RATIONAL) کے معنی ہیں (RATIO) کا حامل۔ اور (RATIO) کے معنی ہیں صحیح صحیح تناسب و توازن۔ لہٰذا انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر بات میں

صحیح صحیح تناسب اور سر کام میں ٹھیک ٹھیک توازن ہو۔ بچہ توازن اور تناسب سے واقف نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم جس بڑے مرد یا عورت کو دیکھو کہ اس کی زندگی میں تناسب اور توازن نہیں، سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچہ ہے۔

(۵) بعض لوگوں کو تم نے دیکھا ہوگا کہ تم ان سے کوئی بات کرو، وہ دو تین منٹ تک تو اسے بڑے غور سے سنیں گے لیکن اسکے بعد اس سے اکتا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگ جائیں گے۔ ان کی انتہائی خواہش ہوگی کہ یہ بات کسی طرح ختم ہو اور کوئی دوسری بات شروع۔ یہ اسلئے نہیں کہ دو تین منٹ کے بعد، وہ بات دلچسپ یا ان کے مفید مطلب نہیں رہی تھی۔ بات تو اُسی طرح دلچسپ اور مفید تھی لیکن یہ کسی ایک بات پر زیادہ دیر تک اپنی توجہ کو مرکوز ہی نہیں رکھ سکتے۔ ان لوگوں کو تم دیکھو گی کہ یہ کسی کام کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے۔ آج ایک کام شروع کیا اور اس میں اس جذب و انہماک سے مشغول ہو گئے کہ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ یہ جب تک اسے ختم نہ کرلیں گے کھانا کھانے تک کے لئے بھی نہیں اٹھیں گے۔ لیکن دو چار دن کے بعد دیکھا کہ وہ اس کام کو چھوڑ کر کسی اور کام کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کی ساری زندگی گذر جاتی ہے ـــــ ناکام اور نامراد ـــــ ان کے مختلف کاموں کو دیکھئے تو کوئی یہاں پڑا ہے کوئی وہاں۔ یہ آدھا ختم ہوا تھا وہ تین چوتھائی۔ لیکن مکمل کوئی ایک بھی نہیں ہونے پایا۔ قابلیت ایسی کہ جو کام شروع کیا اس میں خاص ہنرمندی جھلکنے لگ گئی لیکن طبیعت ایسی کہ کسی پروگرام کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔

سمجھ لو کہ یہ سن رسیدہ بزرگ یکسر "پیر نابالغ" ہیں۔ بالکل بچے۔ اسلئے کہ بچے کسی ایک کام پر زیادہ دیر تک ملتفت رہ ہی نہیں سکتے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی۔ ابھی وہ ہونے لگی۔ ابھی وہ کھیل شروع کیا تھا ابھی اس پر آ گئے۔ اگر جسم کے ساتھ ساتھ بچے کے ذہن کی پختگی نہ ہو تو اس کی یہ روش ساری عمر اس کے ساتھ رہے گی۔

یہاں اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی آدمی کی تمام صلاحیتیں ناپختہ رہی ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذہن کی ایک صلاحیت پختگی حاصل کر گئی ہو اور دوسری ناپختہ رہی ہو۔ اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ مشکل کا موجب بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کی پختہ صلاحیت کو دیکھ کر انھیں پختہ ذہنیت کا انسان سمجھ لیتے ہیں اور جب زندگی کے دوسرے گوشوں میں ان کی ناپختہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے تو اُسوقت اِن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہئے؟

(۶) تم نے بچوں کو دیکھا ہوگا۔ مٹی کا گھوڑا ٹوٹ گیا تو رو رو کر ہلکان ہو گئے۔ اور کسی نے غبارہ لا کر دیدیا تو خوشی سے اچھلنے لگے ان کی خوشی اور غم کے پیمانے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت ان بڑے آدمیوں کی ہوتی ہے۔ جن کی ذہنیت ناپختہ رہ جاتی ہے۔ ذرا سی مخالف بات ہوئی یا اس کے ہونے کا وہم گذرا تو اس طرح افسردہ ہو کر بیٹھے ہیں گویا ان کی ساری کائنات لٹ گئی ہے۔ خود بھی آزردہ بیٹھے ہیں اور دوسروں کو بھی آزردہ کر رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر رو رہے ہیں۔ دوسری طرف اگر ذرا سی خوشی کی خبر سنی تو اچھل رہے ہیں۔ اور اگر آپ ان کے ساتھ اسی پیمانے کے اوچھے پن کا ثبوت نہیں دے رہے تو شکایت ہوتی ہے کہ انھیں تو ہماری خوشی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

(۷) بچوں کی یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے انتقام میں عدل کو کبھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ ذرا کسی پر بگڑے تو پوری قوت سے

اس پر جھپٹ پڑے۔ یعنی ان کے نزدیک جرم اور سزا میں کسی نسبت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ سزا سے ان کا مقصد اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین ہوتی ہے اور بس۔ یہی حالت ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے پیکر میں ذہن بچوں کا سا ناپختہ ہوتا ہے۔ جب ان کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے تو جو شخص ان سے کسی بات میں ذرا سا بھی اختلاف رکھے اسے کچلنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ اس میں عدل کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا، انتقام کا ہوتا ہے۔ وہ مخالف کی تباہی پر اس طرح خوش ہوتے اور اس میں فخر محسوس کرتے ہیں جس طرح بچہ اپنے مخالف کو دھکا دیکر اپنے آپ کو فاتح و منصور تصور کرتا ہے۔

(۸) بچے کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ اس کے پاس دس چیزیں ہوں لیکن اگر کسی دوسرے بچے کے پاس ایک چیز بھی ایسی ہے جو اس کے پاس نہیں تو وہ اپنی دس چیزوں پر کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ اس کی پوری کوشش ہوگی کہ اس بچے کی وہ ایک چیز بھی اس کے پاس آجائے یا کم از کم اس جیسی چیز اسے مل جائے۔ جن بڑوں کی ذہنیت ناپختہ ہوتی ہے ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتیں خواہ انھیں ان کی فی الواقعہ ضرورت ہو یا نہ ہو۔ چونکہ ہمارے زمانے میں اکثریت انہی "نابالغ بڑوں" کی ہے اسلئے مصنوعات کے سوداگران کے اس بچپن کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اشتہار بازی (ADVERTISEMENT) کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان "بچوں" کو ہر وقت یہ بتایا جائے کہ تمہارے پاس یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں۔ اسی میں بازار کی گرمی کا راز ہے۔ آجکل بہت کم چیزیں ضرورۃً خریدی جاتی ہیں۔ بیشتر ان چیزوں کی خرید ہوتی ہے جن کے متعلق اشتہارات سے یہ احساس پیدا کر دیا جاتا ہے کہ تمہارے پاس یہ بھی نہیں۔ اور وہ بھی نہیں۔ تم طاہرہ! اپنی ملنے والیوں کے گھروں کو اپنے سامنے لاؤ اور دیکھو کہ ان کے ہاں کتنی چیزیں ایسی رکھی ہیں جنھیں انھوں نے کبھی ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ ان کے بکسوں اور درازوں میں اسی طرح جمع رہتی ہیں جس طرح جاوید میاں کے جوتے کے خالی ڈبے میں رنگا رنگ کے شیشے اور چینی کے ٹکڑے۔ لوہے کی رنگ آلود سلاخ۔ ٹوپی کا پھندنا۔ سگرٹ کی خالی ڈبیا۔ مورکا پر۔ سلیٹ پنسل۔ چاک کا ٹکڑہ۔ کاغذ کی کترن اور سورج مکھی کا سوکھا ہوا پھول نہایت احتیاط سے رکھے ہوتے ہیں اور وہ اس ڈبے ہی کو بھول چکا ہوتا ہے کہ کہاں رکھا ہے اور پھر اسی قسم کی "متاعِ گراں بہا" کے جمع کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں بچہ کی ذہنیت کی خصوصیات۔ جن لوگوں کی عمر کے ساتھ ساتھ ذہن کی پختگی میں اضافہ نہیں ہوتا ان میں یہی خصوصیات قائم رہتی ہیں اور (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) یہ چیز خود ان کیلئے مصیبت اور معاشرہ کیلئے فساد کا موجب بنتی ہے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بڑے ہونے کے بعد اس روش میں تبدیلی پیدا کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے۔ اسلئے کہ ہمیں خود غیر شعوری طور پر اس غیر ذمہ دارانہ زندگی میں لذت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بچپن کی زندگی کو انسانی زندگی کا بہترین حصہ قرار دیتے ہیں اور پھر سے انہی سہانے دنوں کے لوٹ آنے کی آرزوئیں ہمارے سینے میں مچلتی رہتی ہیں لہٰذا انسان کی صحیح تربیت بچپن ہی کے زمانے میں ہو سکتی ہے، اور اس کے لئے بہترین تربیت گاہ بچہ کا گھر ہے۔ جن گھروں میں اس نقطۂ نگاہ سے بچوں کی تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں کے بچے شروع ہی سے خود اعتمادی، ذمہ داری، ہمدردی، محبت، ایثار، جرأت اور وسعتِ قلب کی خصوصیات لئے ہوئے پروان چڑھتے ہیں۔ جن

گھروں میں تربیت اچھی نہیں ہوتی وہاں بچہ کو ابتداء ہی سے خارجی سہاروں کا خوگر بنا دیا جاتا ہے جس سے اس کے دل میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یا اسے بات بات پر جھڑکی سے اس قدر خوفزدہ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں جرأت اور صداقت کے جذبات نشوونما ہی نہیں پا سکتے۔ کہیں اسے ماں کا لاڈلا بنا دیا جاتا ہے جس سے وہ مردانہ خصائل سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور کہیں وہ باپ کا منظورِ نظر بن جاتا ہے تو اس میں زندگی کی لطیف حسیات کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ کہیں اس قسم کی باتیں کر کے کہ تمہارے ابا کی نوکری چھوٹ گئی تو کیا بنے گا اور یہ مکان چھن گیا تو ہم کہاں جائیں گے، اسے بچپن ہی سے معاشیات کا غلام بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اس کی ہر مانگ کو پورا کر کے اس کے ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا جاتا ہے کہ طبعی ضروریات کا پورا ہو جانا ہی زندگی کا مقصد ہے، اس سے زیادہ مقصودِ حیات کچھ نہیں۔ کہیں اس کے دل میں یہ ڈال کر کہ تمہارے ابا سب سے اچھے اور تمہارا گھر سب سے بہتر ہے اس کی نگاہ کو نسل، وطن اور قومیت کے تنگ دائروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اور کہیں اسے یہ بتا کر کہ دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں اسے انسانیت کے مستقبل سے مایوس اور زندگی کا نوحہ خواں بنا دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے قدم قدم پر آئین و قواعد کا پابند بنا کر چلتی پھرتی مشین بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اسے بالکل آزاد چھوڑ کر اس کے دل سے قانون کا احترام اٹھا دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے غلیظ اور کثیف ماحول میں رکھ کر اس کے دل سے تحسینِ جمال کے نہایت حسین جذبات فنا کر دیئے جاتے ہیں اور کہیں اسے یہ کہہ کر کہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے اس کے کپڑے خراب ہو جائیں گے اس کے دل میں دوسرے افراد سے نفرت اور خود ستائی کے جذبات کا تخم بو دیا جاتا ہے۔ کہیں اس کے کان میں یہ ڈال کر کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است" اسے اندھی تقلید کا خوگر اور انسان سے بھیڑ بنا دیا جاتا ہے۔ اور کہیں اسے یہ کہہ کر کہ معاملات کے فیصلہ کیلئے اپنے دل سے پوچھا کرو اسے مستقل اقدار اور وحی کے غیر متبدل اصولوں سے بھی بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔

اس سے تم نے دیکھ لیا ہوگا طاہرہ! کہ انسانیت کی تشکیل میں گھر کو کسقدر اہمیت حاصل ہے۔ جس قسم کا گھر ہوگا اسی قسم کی قوم پیدا ہوگی اور اسی سے تم سمجھ لو کہ ماں کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں، ماں

سیرتِ اقوام را صورت گر است

یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں امت کا لفظ ہی اُمّ سے نکلا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے بچہ بالکل جاہل ہوتا ہے۔ ماں اسے علم دیتی ہے۔ وہ گونگا ہوتا ہے، ماں اسے زبان دیتی ہے۔ وہ بالکل غیر ذمہ دار ہوتا ہے، ماں اسے ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے۔ اس کے سامنے صرف اپنا مفاد ہوتا ہے، ماں اسے بہن بھائیوں سے محبت کرنا اور دوسروں سے ہمدردی کرنا سکھاتی ہے۔ وہ ہر چیز کے جزو کو دیکھتا ہے، ماں اسے کل کو دیکھنا سکھاتی ہے۔ غرضکہ پیدائش کے لحاظ سے بچہ صرف گوندھی ہوئی مٹی ہوتا ہے، ماں اسے جس قسم کے قالب میں چاہے ڈھال سکتی ہے۔

یہ ہیں بیٹی! اب تمہاری ذمہ داریاں، وہ ذمہ داریاں جو تم پر خود انسانیت کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ خدا تمہیں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق دے اور تم فخر سے کہنے کے قابل ہو سکو کہ میں نے نوعِ انسانی کے اس انبوہ کثیر میں ایک ایسے فرد کا اضافہ کیا ہے جس پر انسانیت کو ناز ہوگا۔

اور ایسا کرنا ناممکن ہے جبتک تم قرآن سے رہنمائی نہ لو۔ اسلئے کہ انسانیت کی تشکیل صرف اسی کے قالب میں ہو سکتی ہے۔ والسلام

پرویز

۱۵ دسمبر ۱۹۵۴ء

اسلام پر
مختلف غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات

(علامہ محترم احمد امین استاد کلیۃ الآداب بالجامعۃ المصریہ)

[زیر نظر مضمون میں اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کون کونسی غیر اسلامی ثقافتوں کا اسلام پر اثر پڑا اور یہ اثرات کن ذرائع اور اسالیب سے مسلمانوں کے اندر داخل ہوئے۔ ان خارجی ثقافتوں میں سے یہودیت اور نصرانیت کا ذکر دسمبر کی اشاعت میں کیا گیا تھا۔ زیر نظر مقالہ میں ایرانی مذاہب کے اثرات سے بحث کی گئی ہے۔ طلوع اسلام]

جن عوامل کا ہم ذکر کرتے آرہے ہیں ان کے اثرات مختلف ثقافتوں کے امتزاج میں کافی دور رس تھے۔ ایرانی اور رومی عادات کا عربی عادات کے ساتھ امتزاج ہوا۔ ایرانی اور رومی قانون کا ان احکام کے ساتھ امتزاج ہوا جن کو قرآن اور سنت نے واضح کیا تھا۔ اہل فارس کی حکم اور اہل روم کا فلسفہ، عربی حکم کے ساتھ مخلوط ہوتا گیا۔ ایرانی اور رومی طرز حکومت، عربی طرز حکومت کے ساتھ گھلتا ملتا چلا گیا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا ہر شعبہ، نظم سیاسی و اجتماعی، طبائع عقلیہ غرضکہ ہر چیز بڑی حد تک اس امتزاج سے متاثر ہوتی چلی گئی۔

چونکہ اقوام مفتوحہ، مدنیت، حضارت اور نظم سیاسی میں عربوں کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ اور نظم اجتماعی کے اعتبار سے عربوں سے کہیں زیادہ مستحکم اور قوی تھیں اسلئے یہ طبیعی چیز تھی کہ ان کی مدنیت، حضارت اور نظم سیاسی کی سیادت قائم ہو جاتی۔ تاہم چونکہ عرب قوی اور فاتح عنصر تھے اسلئے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ انھوں نے اس نظم سیاسی کو جہانتک وہ ان کی عقلیت کے مطابق ہو سکتا تھا اپنا لیا۔ لہذا ان مفتوحہ ممالک میں اسی نظام کی پیروی کی جاتی رہی جو فتح سے پہلے وہاں قائم تھا۔ مثلاً دفاتری نظام وغیرہ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا حتی کہ ان دفاتر کی سرکاری زبان بھی عبدالملک ابن مروان کے زمانہ تک وہی رہی جو ان کی اصلی زبان تھی۔ (عراق اور ایران میں فارسی شام و فلسطین میں رومی اور مصر میں قبطی)۔ ہمارا موضوع اس اجتماعی اور سیاسی نظام کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا موضوع حیات عقلیہ کو بیان کرنا ہے جس کی حالت بعینہ وہی تھی جو سیاسی نظام کی تھی۔ یہ امتزاج دراصل عقل عربی اور عقل اجنبی کا باہمی ازدواج تھا جس کے نتائج کچھ ہی عرصہ بعد سے نمایاں طور پر سامنے آنے شروع ہو گئے۔

ان مفتوحین کی کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کے پاس حکمت، امثال، شعر، ادب غرضکہ کونسی چیز نہیں تھی۔ بلکہ بعض قوموں کے علوم تو مدون صورت میں موجود تھے جن پر بڑی بڑی کتابیں بھی دستیاب ہو سکتی تھیں۔ انھیں علوم کو مدون کرنے اور علمی بحثوں میں حصہ لینے کا سلیقہ بھی تھا۔ جب ان کے قدم اسلام میں جم گئے اور انھیں اطمینان و سکون کی زندگی نصیب ہوئی تو انھوں نے اور ان کی نسلوں نے اپنے علمی رجحانات کو اسلام کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش شروع کیں جس سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد صدیوں سے

مانوس چلے آرہے تھے جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

غضب یہ ہوا کہ اسلامی عقائد بھی اس امتزاج کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کیا آپ گمان بھی کر سکتے ہیں کہ ایک ایرانی، شامی، نصرانی رومی، یا قبائلی جب اسلام میں داخل ہوا ہوگا تو اس کے وہ تمام عقائد جو آباء و اجداد سے صدیوں سے وراثتہً ان میں چلے آرہے تھے قطعاً محو ہو گئے ہوں گے اور اس نے اسلام کو اسی طرح سمجھ لیا ہوگا جیسا کہ اسلام نے سمجھانا چاہا تھا؟ ہرگز نہیں! ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ علم النفس اس امکان کو تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ ایک ایرانی کے ذہن میں "اللہ" کا جو تصور تھا وہ قطعاً ایک نصرانی رومی کے تصور سے مختلف تھا۔ پھر ان دونوں کا تصور ایک نصرانی مصری کے تصور سے اور بھی مختلف تھا۔ پھر مختلف ادیان میں جو الفاظ مستعمل تھے مثلاً جہنم، جنت، ابلیس، ملائکہ، آخرت، نبی، وغیرہ، ان کے معانی اور تصورات جو ایک قوم کے ذہن میں موجود تھے۔ وہ ان معانی اور تصورات سے قطعاً مختلف تھے جو دوسری قوموں کے ہاں رائج تھے۔ ہم یہ گمان ہی نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے یہ لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے تھے انھوں نے ان الفاظ کو ان کے تمام متعلقات کے ساتھ ایسا ہی سمجھا ہوگا جیسا کہ انھیں اہلِ عرب سمجھتے تھے۔ ایسا کرنا تو ان لوگوں کے لئے بھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا جو واقعی خلوصِ دل کے ساتھ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو ہر قوم اپنی پرانی دینی تقالید کے ساتھ خلط ملط کر کے اور ملا جلا کر ہی سمجھ سکتی تھی۔ انھوں نے اسلامی الفاظ کو ان الفاظ کے قریب لا کر ہی سمجھنا تھا جو خود ان کے مانوس ادیان میں مستعمل چلے آرہے تھے۔ اس کے شواہد ایک دو نہیں کثیر تعداد میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً واقدی نے اپنی کتاب فتوح الشام میں نقل کیا ہے کہ شام کے ایک مسلمان آدمی نے دوسرے آدمی سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ اس کی بکریاں چرایا کریگا اور یومیہ اجرت یہ ہوا کریگی کہ دوسرا آدمی اپنی بیوی کو ایک رات شب باشی کیلئے اس کے پاس بھیجا کرے گا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان دونوں آدمیوں کو طلب فرمایا۔ دونوں نے اس امر کا اقرار کیا اور کہا کہ انھیں قطعاً اس کا علم نہیں تھا کہ ایسا معاملہ کر لینا بھی حرام ہے۔ نیز ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بیان کیا ہے کہ دین[1] کے بارہ میں جو تشدد اور سختی ان موالی (آزاد کردہ غلاموں) میں پائی جاتی تھی بادیہ نشین عربوں میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ان[2] اقوام کے اثرات پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے چنانچہ مختلف مذاہب اور فرقوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا جسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ شاید یہی وہ چیز تھی جس کا فتوحات کے وقت حضرت عمرؓ کو سخت اندیشہ تھا۔ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی کتاب "الاخبار الطوال" میں نقل کیا ہے کہ جنگ جلولاء میں مسلمانوں کو اس قدر مال غنیمت حاصل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور جنگی قیدی بھی کثیر تعداد میں ملے جن میں شرفاء فارس کی لڑکیاں بھی تھیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "خدایا! میں ان جلولاء کی گرفتار شدہ عورتوں کی اولاد سے تیری پناہ مانگتا ہوں" چنانچہ صفین[3] کے میدان کی زینت آگے چل کر انہی عورتوں کی اولاد سے قائم ہوئی۔ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے اللہ کی پناہ مانگی تھی اور انھیں حق پہنچتا تھا کہ وہ ان سے پناہ مانگتے، نہ صرف ان سے پناہ مانگتے بلکہ تمام آزاد کردہ غلاموں اور ان کی پوری نسل سے پناہ مانگ سکتے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کی ایک خاصی سیاسی عصبیت تھی جو عربی عصبیت سے نہ صرف الگ

---

[1] یعنی ان کی اپنی تقلیدات کے بارے میں۔ [2] العقد الفرید ج ۲ ص ۹۰-۹۱۔

[3] امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جنگ کا میدان۔

ہی تھی بلکہ اس کی مخالف بھی تھی۔ ان کی اپنی دینی تقلیدات تھیں جن کی طرف ان کا جھکنا لازمی تھا اور اس رجحان اور جھکاؤ کے ساتھ وہ یقیناً اسلام کی عربی سادگی کے برخلاف ہی اپنا راستہ بنا سکتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ یہ امتزاج نہایت ہی قوی اور شدید تھا۔ ان موالی اور ان جیسے اور لوگوں کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں موجود تھا۔ افواج کے درمیان جسمانی جنگوں کی طرح اجتماعی مسائل میں بھی مختلف جنگیں برپا تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ مورخین نے ان جنگوں کی تفاصیل سے بحث نہیں کی حالانکہ تاریخ کا یہ اہم ترین موضوع تھا۔ اسلام اور دیگر مذاہب میں جنگ تھی۔ لغت عربی اور دیگر لغات میں جنگ تھی۔ عربی آرزوؤں اور دیگر اقوام کی آرزوؤں میں جنگ تھی۔ عرب کے سادہ نظم اجتماعی اور ایرانی اور رومی نظم اجتماعی میں جنگ تھی۔ جسمانی جنگیں اگرچہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی فتوحات کے بعد تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ لیکن یہ دوسری جنگیں اس کے بعد عرصۂ دراز تک قائم رہیں اور پوری مملکت اسلامیہ ان مختلف جنگوں کی آماجگاہ بنی رہی جس میں مختلف تمائیں اور آرزوئیں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ اہلِ فارس اپنی قدم مملکت کے ماتم گسار تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ وہ عربوں کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے ترقی یافتہ تھے۔ رومیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اہلِ مغرب اور اہلِ مصر اپنے استقلال کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ مختلف سیاسی نظام ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ اہلِ فارس کا ایک خاص نظام تھا۔ رومیوں کا اس سے مختلف نظام تھا۔ رومی قانون کی سیادت رومی مستعمرات میں تھی اور ایرانی قانون کی سیادت فارسی مملکت میں قائم تھی۔ ان کے مقابلہ میں اسلام تھا جس کا خود ایک قانون تھا جو بعض جزئیات میں ان سے موافقت کرتا تھا اور بعض میں ان سے ٹکراجاتا تھا۔ اہلِ فارس میں سے کچھ تو مجوسی تھے جو مجوسی ہی رہے۔ کچھ ایسے تھے جو مسلمان ہو گئے۔ رومیوں میں بہت سے نصرانی تھے اور بہت سے مسلمان ہو گئے تھے۔ ایسے ہی مصریوں میں سے کچھ نصرانی تھے اور کچھ مسلمان ہو چکے تھے۔ ان شہروں کے یہودیوں میں سے بھی کچھ تو یہودی ہی رہے اور کچھ مسلمان ہو گئے۔ مختلف زبانیں بھی موجود تھیں۔ عربی، فارسی، قبطی، یونانی، عبرانی سب زبانیں بولی جاتی تھیں ـــــ ـــــ یہ تمام رجحانات و میلانات ایک مستقل باہمی جنگ میں مشغول تھے اور پوری مملکت اسلامیہ میدانِ جنگ بنی ہوئی تھی۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان معنوی جنگوں کے واقعات ہم تک بہت کم پہنچ سکے ہیں۔ امت اسلامیہ آگے چل کر امت عربیہ نہیں رہی تھی جس کی زبان ایک، دین ایک اور خیال ایک ہو جیسا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں تھا۔ بلکہ امتِ اسلامیہ مختلف امتوں، مختلف میلانات اور مختلف زبانوں کا مجموعہ بن چکی تھی جو آپس میں برسرپیکار تھیں۔ جنگ برابر چل رہی تھی کبھی اہلِ فارس فتحیاب ہوتے تھے اور کبھی اہلِ عرب کبھی اہلِ روم۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اہلِ عرب نظم سیاسی اور اجتماعی اور اس کے متعلقات مثلاً فلسفہ اور علوم کے میدان میں شکست کھا گئے تھے لیکن دو بڑی چیزوں میں وہ فتحیاب ہوئے ـــــ زبان۔ اور دین ـــــ ان کی زبان کی سیادت ان تمام ممالک میں تسلیم کر لی گئی تھی اور اس کے مقابلہ میں ان ممالک کی اصلی زبانیں شکست کھا گئی تھیں۔ عربی ہی ان ممالک کی سیاسی اور علمی زبان بن چکی تھی۔ یہ فتح و کامرانی ان میں سے اکثر و بیشتر ممالک میں آج تک بھی ان کی حلیف بنتی چلی آرہی ہے۔ بعینہٖ یہی حال دین کا تھا۔ ان تمام ممالک میں دین اسلام کی سیادت تسلیم کی جا چکی تھی اور ان کی بیشتر آبادیاں اسلام کی حلقہ بگوش ہو چکی تھیں۔ بہت کم ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے جو اپنے اصلی دین پر قائم رہ گئے ہوں

ان دونوں عناصر ـــــ زبان اور دین ـــــ کی اس عظیم فتحمندی کے باوجود، دونوں ہی باہمی مزاحمت و منافست سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور دونوں ہی کافی متاثر ہوئے۔ زبان میں وہ پہلا سا سلیقہ باقی نہ رہا اور غلطیاں عام ہوگئیں حتیٰ کہ ایسے قوانین کی ضرورت پڑنے لگی جو ان غلطیوں کی گرفت کر سکیں۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن الاہتم نے بعض آزاد کردہ لوگوں کو دیکھا جو علم نحو میں باہمی مذاکرات کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ آج تم زبان کو درست کر رہے ہو حالانکہ تم ہی اسے سب سے پہلے خراب کرنے والے ہو۔ ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ کاش عبداللہ بن الاہتم نے صفوان، خاقان اور مؤہل بن خاقان کی یاوہ گوئیوں اور غلط گفتاریوں کو سنا ہوتا (تو شاید وہ ان موالی کو معذور رکھتے) اسی طرح زبان عربی پر عجمی الفاظ، عجمی ترکیبیں، عجمی خیالات اور عجمی مضامین نے تسلط جما لیا۔ یہی کچھ تم دین کے متعلق کہہ سکتے ہو۔ وہ اگرچہ مظفر و منصور ہوا لیکن متاثر ہوئے بغیر نہ بچ سکا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان فرقوں میں بٹ گئے اور مختلف مذاہب کی بنیادیں پڑنے لگیں حتیٰ کہ قرآن کی شرحیں ان بیانات سے ہونے لگیں جو دوسروں کے ہاں موجود تھے مثلاً ابتدائے آفرینش عالم سے متعلق افسانے اور قصص غیر یہ فرقے اکثر زبانوں سے ہی لڑتے تھے لیکن کبھی کبھار تلواروں تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔

اب ہم کچھ تفصیلات بیان کرتے ہیں تاکہ ان تحریکات سے متعلق ہمارے موضوع کی وضاحت ہو سکے۔ ہمارا یہ موضوع حرکتِ عقلیہ ہے ـــــ اپنے وسیع ترین معنوں میں ـــــ یعنی علم اور دین۔ اہل فارس کا ایک دین تھا۔ ان کی ایک حکمت تھی۔ ان کی ایک عقلیت تھی۔ اسی طرح اہل روم کا بھی دین، علم اور عقلیت تھی۔ امت اسلامیہ میں ان دونوں عوامل نے بہت گہرا اثر کیا ہے۔ آئندہ سطور میں انہی اثرات کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

اہل فارس کا دین

اسلامی فتوحات سے فارس کا استقلال تو ـــــ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ـــــ جاتا رہا اور وہ مملکت اسلامی کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ اہل فارس کی کثیر تعداد عربوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کچھ غلام بنا لئے گئے اور عربوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے اور کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو چکی تھی۔ ان میں سے بہت سوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی حتیٰ کہ ان کی دوسری نسل عربی زبان میں اسی طرح گفتگو کر سکتی تھی جیسا کہ خود اہل عرب کی اولاد گفتگو کر سکتی تھی۔ لیکن اس سب کے برعکس وہ کلیتہً اپنے عقائد میں عربوں کے مثل نہ بن سکے۔ نہ ہی ان کی عقلیت اہل عرب کی عقلیت کو اختیار کر سکی۔ بلکہ ان لوگوں نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار تو کر لی مگر خود اسلام کو اپنے فارسی رنگ میں رنگ دیا۔ اور اپنے پرانے دین کے تمام عقائد اور تقالید سے علیحدہ نہیں ہو سکے۔ انھوں نے اسلام کو اتنا ہی سمجھا جتنا کہ ان کے قدیمی دین نے سمجھنے کی اجازت دی جسے ان کی قوم نے پشتہا پشت سے قبول کر رکھا تھا، جس میں وہ پیدا ہوئے اور بوڑھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے عربی زبان تو سیکھ لی مگر اپنے فارسی خیالات کو نہیں چھوڑ سکے۔ اور ان امثال، اشعار اور حِکَم کو ترک نہیں کر سکے جو ان کی قوم میں چلے آ رہے تھے۔ اس کا یہ طبعی اثر تھا کہ اسلام میں نئی تعلیمات اور نئے دینی رجحانات داخل ہوتے چلے گئے جن کے اثرات بعد میں ظاہر ہوئے جس کا نمایاں ترین نمونہ اسلام میں شیعیت اور تصوف تھا۔ اسی کا ایک یہ بھی اثر تھا کہ ادب عربی فارسی حکم، فارسی قصص اور فارسی خیالات میں ڈوب گیا۔

چونکہ اہلِ فارس ایک موثر اور پر اثر دین اور ادب کے مالک تھے اسلئے اختصار کے ساتھ پہلے ہمیں ان کے دین و ادب کا مطالعہ

کرلینا چاہیئے تاکہ اس کے بعد ہم اس کے اثرات کو سمجھ سکیں۔ ہمیں ان کے دین کی ابتدا اور ان کے ادب کی اصل اور اسکی تدریجی ترقی سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ چیز ہمارے موضوع کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ دولت ساسانیہ میں جسکی اسلام سے پہلے فارس پر حکومت تھی ان کے دین اور ادب کا کیا حال تھا جو ۲۲۶ عیسوی سے لیکر ۶۵۱ عیسوی تک برسر اقتدار رہا تاآنکہ عربوں نے ان کے ہاتھوں سے حکومت لیلی اور اپنے والیوں اور گورنروں کے ذریعہ ان پر حکومت کی کیونکہ یہ دولت ساسانیہ ہی تھی جس کے اثرات کو دینی اور ادبی جہت سے مسلمانوں نے قبول کیا تھا۔

اہل فارس کا دین

اہلِ فارس ـــــ اور آرین نسل عموماً ـــــ اس میں مشہور چلی آرہی ہے کہ وہ ہمیشہ سے طبیعی مظاہر کی پرستش کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ صاف آسمان، روشنی، آگ، ہوا، پانی جو آسمان سے برستا تھا، ان کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے اور وہ ان کی پرستش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ تمام چیزیں الٰہی کائنات (کائناتی دیوتا) ہیں۔ چنانچہ آفتاب کو وہ خدا کی آنکھ کہتے تھے اور روشنی کو خدا کا بیٹا۔ جیسا کہ تاریکی اور قحط سالی وغیرہ شریر اور ملعون کائناتی دیوتا تھے۔

ابتدائی دور ہی سے انھوں نے انسان کو نیکی (خیر) کے معبودوں اور دیوتاؤں کے سامنے جھکا رکھا تھا کہ وہ ان سے مدد مانگیں ان کیلئے نمازیں پڑھیں، ان کی حمد میں تسبیحیں پڑھیں اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کریں۔

ان کا خیال تھا کہ نیکی کے دیوتا، بدی (شر) کے دیوتاؤں کے ساتھ دائمی جنگ میں مشغول ہیں اور انسانی نیک اعمال مثلاً نمازوں وغیرہ سے بدی کے دیوتاؤں کے مقابلہ میں نیکی کے دیوتاؤں کو ایک حد تک امداد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آگ کو انھوں نے روشنی کا رمز قرار دیا تھا، بالفاظ دیگر آگ نیکی کے دیوتاؤں کا رمز تھی۔ وہ اپنے معابد میں آگ روشن کرتے تھے اور ان معبودوں کی مدد سے اسے پھونکتے رہتے تھے تاکہ بدی کے دیوتاؤں کے خلاف ان کو طاقت حاصل ہو اور وہ ان پر فتحیاب ہوسکیں۔ یہ آگ ان کے نزدیک تازہ شعری تخیل کا منبع اور سرچشمہ تھا۔

(۱) زرتشت

پھر زرتشت (ZOROASTET) ـــــ اہل فارس کے نبی ـــــ آئے جنھوں نے لوگوں کو نئی تعلیمات کی طرف دعوت دی جسکی بنیاد کسیقدر اصلاح کے بعد پرانے دین ہی پر قائم تھی۔

خود زرتشت کا وجود ہی بہت سوں کے نزدیک محل شک اور منکرین و مثبتین کے مابین طویل نزاع کا موجب بنا ہوا ہے۔ جو لوگ ان کے وجود کو ثابت کرتے ہیں ان میں بھی ان کی زندگی کی تاریخ میں ۶۰۰ سنہ قبل مسیح سے ۶۰۰ سنہ قبل مسیح تک بشمار مختلف اقوال ہیں۔ پروفیسر جیکسن (JACKSON) نے ان کی زندگی کے بارہ میں ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے جس نے ان کے وجود کا اثبات کرنے والوں کے پلڑے کو جھکا دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ وہ اپنی بحث میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زردشت ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ یونہی واہی تباہی فرضی افسانوی کردار نہیں ہے یہ قبیلہ میڈیا ـــــ شمال مغربی فارس ـــــ کے چشم و چراغ تھے۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے نصف کے لگ بھگ ان کو شہرت حاصل ہوئی اور تقریباً ۵۸۳ سنہ قبل مسیح میں ستتر سال کی عمر پاکر ان کا انتقال ہوا۔ ان کا وطن آذربائیجان تھا لیکن ابتدائی کامیابی ان کو ایران سے باہر جاکر بلخ میں حاصل ہوئی تھی۔ یعنی شہنشاہ بشتاسپ[1] کے زردشتی دین میں داخل ہوجانے کے بعد۔ ان کا دین بلخ سے

---

[1] اس کا نام شاہنامہ میں گشتاسپ لکھا ہے۔

بڑھکر تمام فارس میں پھیلتا چلا گیا۔

لیکن اس کے باوجود یہ تمام نتائج جن تک جیگیں پہنچے ہیں ہمیشہ محل نظر رہیں گے۔ زردشت کے پیرو بہت سی ایسی باتیں بھی نقل کرتے ہیں جو ان کی ولادت کے وقت سے معجزات، خوارق عادات اور اشارات کی صورت میں ان کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ اور یہ کہ وہ بچپن ہی سے تفکر اور تدبر میں لگ گئے تھے اور تنہائی اور گوشہ نشینی کی طرف ان کا رجحان بڑھتا جاتا تھا ـــــ اس دوران میں انھوں نے سات خواب دیکھے تھے۔ ان خوابوں کے بعد انھوں نے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ خدا کے رسول ہیں۔ خدا نے انھیں اسلئے بھیجا ہے کہ دین کے ساتھ جو گمراہیاں منسلک ہو گئی ہیں وہ ان کو دور کر دیں اور حق کی طرف لوگوں کو ہدایت دیں۔ وہ عرصۂ دراز تک لوگوں کو دعوت دیتے رہے مگر تھوڑے سے لوگوں کے سوا کسی نے ان کی دعوت پر کان نہ دھرا۔ تب خدا نے ان کو وحی فرمائی کہ وہ بلخ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ وہاں پہنچکر شاہی محلات میں انھوں نے اپنی دعوت کو پھیلایا۔ اولاً وزیر کی اولاد اور خود ملکہ نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا۔ شاہی محلات کے دوسرے ذمہ دار لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا لیکن خود بادشاہ ـــــ بشتاسپ ـــــ کے ان کے دین میں داخل ہو جانے سے فتحمندی انہی کے حصہ میں آئی۔ بادشاہ نے اس نئے دین کو قبول کر لیا تو دوسرے لوگ بھی فوج در فوج ان کے دین میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔

زردشت کی تعلیمات

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ زردشت سے پہلے اہل فارس نے اپنا دین دو بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا۔ (۱) اس دنیا کا ایک قانون ہے جس پر وہ چل رہی ہے اور اس کے طبیعی ظواہر ثابت اور موجود ہیں۔ (۲) یہاں مختلف قوتوں ـــــ نور و ظلمت، سرسبزی و قحط سالی وغیرہ ـــــ میں تزاحم و تصادم ہو رہا ہے۔ زردشت کی تعلیمات بھی انہی دونوں بنیادوں پر مبنی تھیں البتہ ان سے پہلے ارواح خیر کی پرستش کی جاتی تھی جو کثیر التعداد تھیں۔ زردشت نے ان ارواح کو ایک خدا میں جمع کر کے توحید قائم کر دی۔ اس خدا کا نام "اہورامزدا" تھا۔ یہی کچھ انھوں نے بدی کی قوتوں کے متعلق کہا یعنی ان کو بھی انھوں نے ایک واحد چیز یعنی "دروج اہرمن" میں منحصر کر دیا۔ اس طرح ان کے جدید مذہب میں صرف دو قوتیں باقی رہ گئیں۔ قوتِ خیر اور قوتِ شر۔

زردشت کی کتاب مقدس کا نام "اَفِسْتَا" (AVESTA) ہے جس کی ایک شرح ہے جس کا نام "زند افست" ہے۔ مسعودی نے کہا ہے کہ اس کتاب کا نام "الایستا" ہے، جسے معرب بناتے وقت ایک قاف بڑھا لیا جاتا اور "الایستاق"[1] کہا جاتا ہے۔ اسکی سورتوں کی تعداد اکیس ہے اور ہر سورت دو سو اوراق میں آئی ہے۔ یہ پرانی فارسی زبان میں لکھی ہوئی ہے جس کے معنی آج کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی چند سورتیں موجودہ فارسی میں ترجمہ کر کے منتقل کر لی گئی ہیں جو آج زردشتیوں کے پاس ہوتی ہیں اور جنھیں وہ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ کچھ سورتوں میں مبدا، عالم اور منتہائے دنیا کے متعلق خبریں ہیں اور کچھ میں نصائح ہیں۔

افتا کی اصل اور اس کی سورتوں کے مصنفین کا سوال محققین میں ہمیشہ محل نزاع رہا ہے جیسا کہ خود زردشت کی شخصیت محل نزاع بنی رہی ہے۔ افتا، دولت ساسانیہ میں اکیس سورتوں پر مشتمل ہوتی تھی مگر آج ہمارے زمانے میں سوائے ایک مکمل سورت اور مختلف سورتوں کی متفرق

---

[1] یاء کے ساتھ ہی نقل کیا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ایستاق" کی یا تصحیف ہے جو دراصل بار ہے کیونکہ فارسی لغت میں فا کو بار سے بدل لیتے ہیں۔ لہٰذا اس کی صحیح کتابت "ابستاق" ہوگی۔

آیات کے اور کچھ نہیں ملتا۔ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ چند دینی شعائر و رسوم سے متعلق حصوں اور معابد زردشتیہ کے قوانین پر مشتمل ہے۔

مسلمانوں نے فتح کے بعد ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کیا اور ان کی کتاب کو انھوں نے آسمانی کتاب کی طرح ہی شمار کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا طرز عمل اسی کے مطابق رہا کیونکہ ان کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی تھی کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو۔ الخ۔

ان کی تعلیمات میں سے مشہور یہ ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی دو اصل اور دو آلہ ہیں۔ خیر کی اصل "اہورا" یا "اہورامزدا" ہے اور شر کی اصل "اہرمن"[1] ہے اور یہ دونوں دائمی نزاع میں مشغول رہتے ہیں۔ ان دونوں اصلوں کو تخلیق کی قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ خیر کی اصل نور ہے جس نے وہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں جو خوشنما، خیر اور سود مند ہیں۔ اس نے نظام، حق، نور، چوکیداری کا کتا، اور مرغ وغیرہ ایسے جانور جو فائدہ مند ہیں پیدا کئے۔ اور مومن کے ذمہ ضروری ہے کہ ان کے ساتھ عنایت کا برتاؤ کرے۔ شر کی اصل تاریکی ہے اور دنیا میں جتنی چیزیں شر ہیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ اس نے درندہ جانوروں، سانپوں، اژدہوں، حشرات الارض اور ہوام کو پیدا کیا اور مومن پر فرض ہے کہ جہاں انھیں پائے قتل کر دے۔ ان دونوں روحوں کے درمیان جنگ برپا ہے جس میں کبھی ایک روح کو فتح حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی دوسری کو لیکن آخری کامیابی خیر کی روح کو حاصل ہوگی۔ اس جنگ میں لوگ دونوں روحوں کی طرف بٹ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ "اہورا" کی مدد کرتے ہیں اور کچھ لوگ "اہرمن" کی۔ یہ دونوں روحیں بذات خود جنگ نہیں کرتیں بلکہ اپنی مخلوقات کے ذریعہ سے جنگ کرتی رہتی ہیں۔

انسان، ان دونوں روحوں کے درمیان محل نزاع بنا ہوا ہے۔ کیونکہ انسان کو "مزدا" نے پیدا کیا تھا لیکن اس نے اس کو ارادہ کے اعتبار سے آزاد اور مختار پیدا کیا تھا۔ لہٰذا اسے یہ بھی قدرت تھی کہ وہ شریر قوتوں کے سامنے جھک جائے۔ انسان کو اسکی زندگی میں دونوں قوتیں اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں۔ ان میں سے جو شخص دین حق کا حلقہ بگوش ہو جاتا اور نیک کام کرتا ہے اور اپنے نفس اور بدن کو پاک رکھتا ہے وہ شر کی روح کو ذلیل کر دیتا ہے اور بھلائی کی روح کی امداد کرتا ہے اور اس طرح "مزدا" کی طرف سے ثواب کا مستحق ہوتا ہے ورنہ وہ شر کی روح کو قوت دیتا اور "مزدا" کو اپنے اوپر ناراض کر لیتا ہے۔

اس مذہب کے اہم ترین مبادی میں سے یہ امر بھی ہے کہ انسان کا شریف ترین پیشہ زراعت اور جانوروں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ لہٰذا اس نے انسان کیلئے زراعت کو اور اپنے جانوروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو، نیز سعی و عمل کی زندگی گذارنے کو محبوب ترین مشغلہ بنا دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے متبعین پر روزہ رکھنے کو حرام قرار دیدیا تھا کیونکہ اس سے انسان کے عملی قویٰ میں ضعف پیدا ہوتا تھا اور وہ انھیں قوی، تندرست اور کارکردگی میں مشغول دیکھنا چاہتا تھا۔

انھوں نے یہ تعلیم بھی دی تھی کہ پانی، ہوا، آگ اور مٹی پاک عناصر ہیں جن کا ناپاک ہونا جائز نہیں ہو سکتا۔ اسی کے مظاہر میں سے آگ کو مقدس قرار دینا اور ایک رمز خداوندی بنا لینا تھا۔ ایسے ہی اس نے جاری پانی کو ناپاک کر دینا اور مردوں کو زمین میں دفن کرنا حرام قرار دیا تھا۔ وغیر ذلک۔

انسان کی دو قسم کی زندگیاں ہوتی ہیں، حیات اولیٰ دنیا میں ہوتی ہے اور حیات اخریٰ موت کے بعد۔ حیات آخرت میں اس کا حصہ دراصل حیات اولیٰ کے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے یہ تمام اعمال ایک کتاب میں نمبروار درج کئے جاتے ہیں۔ نیز اس کی برائیاں اور

---

[1] خیر کے خدا کو یزداں بھی کہتے ہیں چنانچہ ابوالعلاء معری نے اپنے اشعار میں یزداں اور اہرمن ہی نقل کیا ہے۔

بداعمالیاں ایک دوسرے دفتر میں درج کی جاتی ہیں۔ موت کے بعد تین دن تک انسانی روح اپنے جسم کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے اور اپنے دنیوی اعمال کے مطابق راحت و آرام یا شقاوت و بدبختی حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تین دنوں میں نفس کو مانوس کرنے کیلئے خاص دینی شعائر ادا کئے جاتے ہیں۔ حساب و کتاب کے بعد یہ روح ایک پل کے اوپر سے گذریگی جو جہنم کے دہانہ پر لگایا جائیگا۔ یہ مومن کیلئے تو چوڑا ہوگا جس پر سے گذرنا آسان ہوگا لیکن کافر کیلئے یہ بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ جو لوگ مومن ہوں گے اور نیک کام کریں گے وہ سلامتی کے ساتھ اس پل پر سے گذر جائیں گے اور "اہورا" سے ملیں گے جو انھیں خوش آمدید کہیگا اور بڑی عمدہ جگہ میں انھیں اتاریگا اور جو بدکار ہوں گے وہ جہنم میں گر جائیں گے اور "اہرمن" کے غلام بن جائیں گے۔ جن لوگوں کی نیکیاں اور بدیاں برابر برابر ہوں گی تو ان کی روح "اعراف" میں چلی جائیگی جہاں وہ فیصلہ ہو جانیکے دن تک مقیم رہے گی۔

جو کچھ خدا نے انسان کیلئے اس کے مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے تیار کر رکھا ہے وہ اس کی حیاتِ دنیوی میں اس کی نگاہوں سے مستور کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ خیر و شر میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ اپنا رسول بھیجکر لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ زردشتی اساطیر میں یہ بھی ہے کہ نبوت سب سے پہلے جمشید (شہنشاہِ فارس) پر نازل ہوئی تھی لیکن وہ اس بار کو اٹھا نہیں سکا چنانچہ زردشت نے اس بار کو اٹھالیا چنانچہ خدا ان سے براہِ راست کلام فرماتا اور ان پر وحی نازل کرتا تھا۔

زردشت کی یہ بھی تعلیم ہے کہ قیامت کا دن قریب ہے اور اس زندگی کی انتہا کچھ زیادہ دور نہیں ہے عنقریب "مزدا" اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے شر کے دیوتا کو فیصلہ کن شکست دیگا اور اسے اور اس کے پیروکاروں کو جہنم میں عذاب دیگا۔

فلسفۂ زردشت

ان دینی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو دین زردشتی میں ماوراء مادہ کے متعلق بھی بحثیں ملتی ہیں۔ لیکن ان کی بحث اس موضوع پر ایسی مکمل نہیں ہے جیسا کہ یونانیوں کے ہاں مکمل ملتی ہے بلکہ ایک جزئی سی بحث ہے جو منتشر طور پر ملتی ہے۔ اسکے علاوہ ان کی بحثوں میں وہی خصوصیت ملتی ہے جو عربوں کے ہاں اسلام کے بعد ملتی ہے۔ یعنی ماوراء مادہ سے متعلق اپنی ان بحثوں کو دین کے ساتھ خلط کر دینا اور دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کرنا۔ انھوں نے اس موضوع پر کوئی الگ مستقل بحث نہیں کی جیسا کہ یونانیوں نے کی ہے۔

ان کی فلسفیانہ ابحاث میں سے ایک نفس کی بحث بھی ہے۔ دین زردشتی کی رائے میں نفس انسانی کو خدا نے عدم سے پیدا کیا ہے اور وہ حیات ابدیہ سعیدہ حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ حیاتِ ارضی میں شر اور بدی سے جنگ کرتا رہا ہو۔ خدا نے اسے حریت ارادہ عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ خیر کو بھی اختیار کر سکتا ہے اور شر کو بھی۔ نیز یہ بھی کہ نفس انسانی کو مختلف قوتیں حاصل ہیں۔ (۱) ضمیر یا وجدان (۲) قوت حیوانیہ۔ (۳) قوت عقلیہ (۴) قوت روحانیہ (۵) قوت واقیہ یعنی قوت حافظہ وغیرہ۔

اس کے بعد یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ کیا دین زردشتی ایک ثنوی دین ہے؟ یعنی کیا ان کی رائے میں کائنات پر دو خدا حکومت کر رہے ہیں۔ ایک آلہ خیر اور دوسرا آلہ شر۔ اور ہر خدا کی اپنی مستقل ہستی ہے؟ یا کیا یہ دین توحید کا قائل ہے اور اس کی رائے میں کائنات پر صرف ایک ہی آلہ حکمران ہے۔ اور یہ کہ کیا کائنات میں جو کچھ خیر اور شر پایا جاتا ہے اور ان دونوں قوتوں میں جو تنازع چلا آرہا ہے وہ درحقیقت ایک ہی آلہ کے دو مظہر یا اس کے دو متضاد اثرات ہیں؟ محققین نے اس سوال کے جواب میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر کی رائے تو یہی ہے کہ یہ

ثنوی دین ہے جیسا کہ زردشت کے ظاہر کلام سے متبادر ہوتا ہے۔ اسی رائے کی طرف بعض انگریز مصنفین کا بھی رجحان ہے۔ چنانچہ دائرۃ المعارف بریطانیہ (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا) کے مصنف نے "زردشت" کے بارہ میں یہی کچھ لکھا ہے۔ لیکن بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ زردشت موحد ہیں۔ چنانچہ شہرستانی اور قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ پروفیسر ہوج (HAUG) فرماتے ہیں کہ زردشت لاہوتی اعتبار سے موحد ہیں اور فلسفی اعتبار سے ثنوی ہیں۔ غالباً ان کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ عقیدۂ دینی کے اعتبار سے تو ان کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا الٰہ ایک ہی ہے۔ لیکن جب وہ کائنات کے فلسفہ کی شرح کرتے ہیں اور کائنات کے خیر و شر سے گفتگو اور بحث کرتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کو پیسے ڈال رہے ہیں تو وہ اس اعتبار سے ثنوی بن جاتے ہیں اور ان کی رائے یہ ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں درحقیقت دو قوتیں کارفرما ہیں جن کا یہاں سکہ چل رہا ہے۔ . . . . . .

ان کے مذہب کو پڑھ لینے کے بعد غالباً آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں میں ان کی تعلیمات نے کتنا بڑا اثر کیا ہے۔ مذاہب دینیہ پر گفتگو کرتے ہوئے ہم آگے اس کی وضاحت کریں گے۔ مگر اجمالی طور پر ہمیں یہاں اتنا تو بیان کر دینا ہی چاہئے کہ پل صراط کے بارہ میں عام مسلمانوں کا عقیدہ اسی طریقہ کا ہے جسے زردشت نے نقل کیا ہے۔ ایسے ہی اس طور پر اعراف کے متعلق عقیدہ اور جسم کے اوپر مرنے کے بعد روح کا تین دن تک منڈلاتے رہنے کا خیال اور اسی وجہ سے تیجے تک خاص خاص رسوم کی ادائیگی۔ یہ تمام عقائد زردشتی عقائد سے مکمل مشابہت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی جبر و اختیار کے بارہ میں معتزلہ کی بحثیں اور نفس کی اقسام کے متعلق صوفیہ کے بیانات یہ سب کچھ دین زردشتی سے لیا گیا ہے۔ اس موضوع سے ہم اس کے محل میں دوبارہ بھی گفتگو کریں گے۔

ب۔ مانی اور مانویت

دینی مذاہب میں سے مشہور ترین مذہب ـــــ جس کے متبعین بھی بکثرت تھے ـــــ مانویت تھا۔ مانی ـــــ اس دین کا بانی ـــــ جیسا کہ البیرونی نے اپنی کتاب، الآثار الباقیہ میں لکھا ہے ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں پیدا ہوا۔ اور سخت مخالفتوں کے علی الرغم اس کا دین ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی تک زندہ تھا۔ اور ایشیا اور یورپ میں اس کے متبعین بکثرت موجود تھے۔ دینی آراء میں بھی اس کا کافی اثر پایا جاتا تھا۔ اس کی تعلیمات دراصل نصرانیت اور زردشتیت کا مجموعہ تھیں۔ اسے ـــــ جیسا کہ پروفیسر براؤن کا کہنا ہے ـــــ زردشتی رنگ میں رنگی ہوئی نصرانیت کے بجائے نصرانیت کے رنگ میں رنگی ہوئی زردشتیت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کے متعلق معلومات کا سرچشمہ عربی اور یورپین کتابیں ہیں۔ براؤن نے عربی سرچشموں کی توثیق کی ہے اور انھیں صحت سے قریب تر قرار دیا ہے۔ عربی سرچشموں میں سے ابن حزم کی "الفصل فی الملل والنحل" اور شہرستانی کی "الملل والنحل" ابن الندیم کی "الفہرست" یعقوبی کی "التاریخ" البیرونی کی "الآثار الباقیہ" اور ابن نبانہ کی "شرح العیون" وغیرہ کتابیں ہیں۔

اس کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ـــــ جیسا کہ زردشت نے کہا تھا ـــــ دو اصلوں سے پیدا ہوئی ہے ـــــ نور[1] اور ظلمت[2]۔ نور سے ہر بھلی چیز پیدا ہوئی اور تاریکی سے ہر بری چیز پیدا ہوئی۔ نور کو شر پر قدرت حاصل نہیں اور ظلمت کو خیر پر کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان سے جو خیر سرزد ہوتی ہے اس کا سرچشمہ خیر کا خدا ہے اور جو شر صادر ہوتا ہے اس کا سرچشمہ شر کا خدا ہے۔ اگر انسان رحمت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو یہ نظر خیر اور نور کی نظر ہوتی ہے اور اگر قساوت اور سنگدلی کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ شر اور ظلمت کی نگاہ ہوتی ہے۔

ایسے ہی تمام حواس کا حال ہے۔ اس دنیا میں خیر اور شر کا مکمل امتزاج ہو چکا ہے۔ مانی اور اس کے اصحاب نے اس امتزاج کی کیفیت کے بارہ میں وہ وہ باتیں کہی ہیں جنھیں خرافات کے نام سے یاد کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔

اس بارہ میں وہ زیادہ تر زردشت کی تعلیمات سے باہر نہیں جاتا۔ جب کہ آپ خود دیکھ رہے ہیں ـــــ لیکن امر جوہری میں وہ زردشت کے خلاف چلا جاتا ہے۔ یعنی زردشت کی یہ رائے تھی کہ موجودہ دنیا عالم خیر ہے۔ کیونکہ اس میں شر کے اوپر خیر کی فتح یابی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ جبکہ مانی کی یہ رائے ہے کہ خیر و شر کا یہ امتزاج خود ایک شر ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے۔ زردشت کی رائے یہ تھی کہ انسان کو طبیعی زندگی گذارنی چاہئے لہٰذا شادی کرنا، اولاد پیدا کرنا، کھیتی باڑی کرنا، جانوروں اور ان کی نسل کی خبر گیری کرنا، اپنے بدن کو طاقتور بنانا حتیٰ کہ روزے نہ رکھنا ضروری ہے۔ انسان اس قسم کی زندگی گذار کر شر کے دیوتا کے خلاف خیر کے دیوتا کی مدد کرتا ہے۔ لیکن مانی قطعاً ایک دوسرا ہی راستہ پیدا کرتا ہے جو رہبانیت سے زیادہ قریب ہے۔ مانی ـــــ جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے ـــــ حرّان میں ایک راہب تھا۔ اس کی رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں نور کا ظلمت کے ساتھ امتزاج ایک شر ہے۔ چنانچہ اس نے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے تاکہ فنا جلد سے جلد آسکے۔ اس نے زہد کی دعوت دی اور ہمیشہ ہر ماہ سات دن کے روزے فرض کئے۔ بہت سی نمازیں فرض کیں۔ آدمی کھڑا ہو۔ وضو کرے اور آفتاب کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جائے۔ پھر کھڑا ہو، سجدہ کرے اور اسی طرح کرتا رہے تا آنکہ بارہ سجدے ہو جائیں۔ ہر سجدہ میں خاص دعائیں پڑھے۔ اس نے اپنے متبعین کو جانور ذبح کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ اس میں جانوروں کو تکلیف دینا ہے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ اور زردشت دونوں کی نبوت کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ (یعنی مانی) وہی نبی ہے جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔

کہتے ہیں کہ ہرمز ـــــ شہنشاہ ایران ـــــ نے اس کے مذہب کی حلقہ بگوشی قبول کر لی تھی اور اس مذہب کی بہت تائید کی تھی چنانچہ اس کے بعد لوگ بکثرت اس کے دین میں داخل ہونے لگے لیکن جب ہرمز مر گیا اور بہرام اول اس کا جانشین ہوا تو وہ اس کی تعلیمات کی طرف مائل نہیں ہو سکا اور نہ وہ اسے پسند آئیں۔ اس نے مانی کو قتل کر دیا اور اس کے متبعین کو منتشر کر دیا۔ لیکن اس کی تعلیمات مر نہیں سکیں اور اس کے دین کے امام یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہے۔ امام کا مرکز ابتداءً بابل تھا۔ پھر سمرقند منتقل ہو گیا۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ جب اہل فارس کی مملکت تتر بتر ہو گئی اور عربوں کی حکومت کو استحکام حاصل ہوتا گیا تو مانوی مذہب کے پیرو اپنے شہروں میں واپس آ آ کر بسنے لگے۔ خصوصاً ایرانی مملکت کے آخری آزمائشی دور اور سلاطین بنو امیہ کے دور حکومت میں ان کی واپسی بہت تیز ہو گئی۔ بالآخر مقتدر کے دور حکومت میں یہ لوگ فارس سے پھر بھاگے اور اپنی جانوں کے خوف سے خراسان کی طرف روپوش ہو گئے۔ جو بچے کھچے لوگ رہ گئے تھے انھوں نے اپنی مانویت کو چھپایا اور بظاہر مسلمان بن کر اسلامی مقامات میں مقیم رہے۔ خود بغداد میں معز الدولہ کے زمانہ میں تقریباً تین سو آدمیوں کو میں پہچانتا تھا کہ وہ مانویت کے متبع ہیں لیکن آج ہمارے وقت میں پانچ نفوس بھی کہیں نظر نہیں آتے۔" اس کے بعد ابن الندیم نے ان کے کچھ رؤسا کے نام گنوائے ہیں جو بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے مگر باطن زندیق تھے۔ چنانچہ ابن الندیم نے جعد بن درہم کو جو مروان بن محمد (بنو امیہ کا آخری خلیفہ) کا مؤدب تھا انہی لوگوں میں سے شمار کیا ہے۔ علاوہ ازیں خالد بن عبد اللہ القسری بھی اپنی رائے

کے لحاظ سے زندیق تھا۔ ایسے ہی صالح بن عبدالقدوس، بشار بن بُرد، مسلم الخاسر وغیرہ بھی۔ ابن الندیم کا بیان ہے کہ "برامکہ میں سوائے محمد بن خالد بن برمک کے سب کے سب زندقہ کے ساتھ متہم کئے جاتے تھے۔ اس مذہب کے لوگوں کی تحریرات میں تو میں نے یہاں تک پڑھا ہے کہ ماموں رشید بھی ان ہی میں سے تھا لیکن یہ ان لوگوں کا صریحی جھوٹ ہے۔ بہرحال آجکل ان لوگوں کی ریاست سمرقند میں ہے"۔

یہ مذہب یورپ میں بھی جنوبی فرانس تک پھیلا۔ چنانچہ لوگوں کا بیان ہے کہ سینٹ (AUGUSTINE) عرصہ دراز تک مانوی مذہب کا پیرو کار رہا ہے اس کے بعد اس نے نصرانیت کو اختیار کر لیا تھا۔

مسلمانوں میں علم کلام کا کافی بڑا حصہ ان کی تعلیمات سے متعلق ہے متکلمین ان کی آراء کو ذکر کرتے ہیں اور پھر ان کا رد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مذہب کے متبعین نے بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ مثلاً معاد کی بحث کہ کیا وہ اجسام کے ساتھ ہوگا یا محض ارواح کے ساتھ ہوگا۔ آگے چل کر خود مسلمان اس بحث میں الجھ گئے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

یہاں دو مسائل قابل بحث ہیں۔

(۱) اسلام سے پہلے بھی اور اسلام میں بھی مانویت تختۂ مشق ستم کیوں بنی رہی؟

اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ بہرام کو جس چیز نے مانی اور اس کے اصحاب کے قتل پر برانگیختہ کیا وہ عملی نقطۂ نظر تھا۔ زردشت عمل کی طرف دعوت دیتا تھا۔ اسکی تعلیمات قومیت اور جنگی رجحانات کی مؤید تھیں جو اس زمانہ کے ایرانی ذوق کے مطابق تھیں۔ مانی کی تعلیمات ان کے بالکل برعکس تھیں۔ وہ زہد اور زندگی کی لذات سے نفرت اور جلد از جلد فنا کو لے آنیکی طرف میلان رکھتی تھیں۔ یہ تعلیمات ——— کوئی شبہ نہیں ——— فارس جیسی جنگجو مملکت کیلئے انتہائی خطرہ کا باعث تھیں۔ اسکی تائید "الآثار الباقیہ" کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ بہرام نے کہا تھا "یہ شخص دنیا کی تخریب کی دعوت دینے کیلئے نکلا ہے۔ اس سے پہلے کہ اسکی کوئی مراد پوری ہو سکے ضروری ہے کہ ہم خود اسی کی تخریب کا سامان بہم پہنچا دیں"۔ اس پر اتنا اضافہ اور کر لو کہ یہ لوگ ——— جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے ——— اپنے دین کی طرف دعوت دینے میں بڑی جدوجہد سے کام لیتے تھے۔ اسلام یا نصرانیت کے لبادہ میں چھپ چھپ کر دعوت کی سہولتیں حاصل کرتے تھے اور مخالفت سے مامون ہو کر اپنا کام کرتے رہتے تھے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ "زندقہ" کا لفظ عموماً مانی کے متبعین کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تو کیا یہ لفظ ان کے ساتھ خاص ہے؟

ابن الندیم کی عبارتوں سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "زنادقہ" کا لفظ مانی کے اصحاب اور اس کے مذہب کے حلقہ بگوش لوگوں کیلئے بولا جاتا تھا یعنی یہ کوئی عام کلمہ نہیں تھا جو ہر کافر اور ملحد پر بول دیا جاتا ہو۔ خیاط معتزلی کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی کتاب "الانتصار" میں اس لفظ کو کسی خاص فرقہ پر دلالت کرنے کیلئے یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ "ابن الراوندی کا بیان ہے کہ ثمامہ نے بیان کیا کہ اکثر یہود و نصاریٰ اور مجوس اور زنادقہ اور دہریہ قیامت میں مٹی ہو جائیں گے اور جنت میں داخل نہیں ہونگے ..... الخ خیاط نے اس لفظ کو اپنی کتاب میں تقریباً پانچ مرتبہ استعمال کیا ہے اور اسی طرح کی تعبیر میں وہ اس لفظ کو لایا ہے۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب "المعارف" میں جاہلیت میں عرب کے ادیان پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نصرانیت ربیعہ اور غسان اور کچھ قضاعہ کے خاندان میں تھی، یہودیت، حمیر، بنو کنانہ، بنو حارث بن کعب اور کندہ میں تھی، مجوسیت تمیم میں تھی۔ چنانچہ ان میں سے زرارہ، حاجب بن زرارہ اور اقرع بن حابس مجوسی تھے۔ زندقہ قریش میں تھا جسے ان لوگوں نے حیرہ والوں سے لیا تھا" ابن قتیبہ کی اس تعبیر سے ظاہر ہے کہ زندقہ سے مراد اہل فارس کے ادیان میں سے کوئی خاص دین ہے کیونکہ اس کے بعد وہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ زندقہ کو قریش نے حیرہ والوں سے لیا تھا۔ حیرہ ـــــ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ـــــ اہلِ فارس کے اقتدار حکومت میں تھا۔ جوہری نے بھی صحاح میں اسی کے قریب قریب کہا ہے کہ "زندیق بت پرستوں میں سے ایک فرقہ ہوتا ہے یہ لفظ معرب ہے اس کی جمع زنادقہ ہوتی ہے۔ قد تَزَندَقَ فعل آتا ہے اور زَندَقَۃ اسم ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زندقہ، نصرانیت اور یہودیت کی طرح کوئی خاص مذہب ہے اور علی العموم الحاد کے معنی میں اس کا استعمال کرنا ایک نو پیدا شدہ معنی ہیں جو بعد میں پیدا ہو گئے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ "زندیق، بقاء دہر کے قائل کو کہتے ہیں یہ دراصل فارسی لفظ ہے اور زَندکَرد کا معرب ہے یعنی بقاء دہر کا قائل"۔ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے کہ کلام عرب میں زندیق کا لفظ نہیں تھا۔ اس (زندیق) کے مفہوم کو ادا کرنے کیلئے اہل عرب مُلحِدٌ اور دَہرِیٌّ کے الفاظ بولتے تھے۔" لیکن کیا یہ لفظ ہر بت پرست قوم پر بولا جاتا ہے یا بت پرستوں کے کسی خاص مذہب مثلاً صرف مانویت پر بولا جاتا ہے؟ تو ابن قتیبہ کے کلام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ کسی خاص مذہب پر ہی بولا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے کلام میں اس کے بالمقابل مجوسی کا لفظ لائے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا ہے کہ بنو تمیم مجوسی بن گئے تھے اور قریش زندیق بن گئے تھے۔ اگر زندقہ سے ان کی مراد علی العموم بت پرستی ہوتی تو اس جگہ اس مقابلہ کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ صحاح میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ جوہری نے کہا ہے کہ "زندیق بت پرستوں میں سے ہوتے ہیں۔ انھوں نے یوں نہیں کہا کہ زندیق بت پرست ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا یہ لفظ صرف مانویت ہی پر بولا جاتا ہے؟ آلوسی نے ابن الکمال سے نقل کیا ہے کہ یہ لفظ مزدکیت پر بولا جاتا ہے اور مزدک نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "زند" تھا اور مزدکیت، مانویت سے الگ کوئی مذہب ہے"۔ مگر یہ بیان غلط ہے کیونکہ مزدک نے "زند" نام سے کتاب نہیں لکھی۔ یہ دراصل "افستا" کی شرح کا نام ہے جو زردشت کی کتاب ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل "زندیق" فارسی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جو "زند" کا اتباع کرتا ہو۔ اس کے بعد اس کا اطلاق مانویت پر کیا جانے لگا کیونکہ یہ لوگ بھی زند وغیرہ کتب مقدسہ کو مانتے ہیں اور تاویل کے طریقہ سے ان کی شرح اپنے مذہب کے مطابق کر لیتے ہیں۔ استاذ "بیقان" کہتے ہیں کہ الفہرست اور البیرونی کے کلام سے ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ مانوی مذہب کے پیرو "سَمّاعین" کا لفظ ان لوگوں پر بولتے ہیں جو مانویت کے بلند ترین درجہ تک فائز نہیں ہو سکے۔ یہ لوگ ان تمام واجبات کو جسے یہ دین فرض قرار دیتا ہے مثلاً رہبانیت اور زہد وغیرہ کو بالالتزام ادا نہیں کرتے۔ اور ان کے مقابلہ میں "صدیقون" کا لفظ ان ترقی یافتہ لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو بالالتزام ان تمام واجبات کو ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ مالداری پر فقر کو فضیلت دیتے ہیں۔ دنیا اور دنیوی ماحول سے گریز کرتے ہیں۔ صدّیق عربی لفظ ہے لیکن اس کی آرامی اصل موجود ہے۔ یعنی صدیقی (SADDIQAI) اہل فارس نے اس لفظ کو لیا اور زندیق بنا لیا۔ انھوں نے

مشدد دال کی جگہ نون اور دال رکھدیا جیسا کہ سبّاذ (SABBATH) کو یہ لوگ شنباذ (SHAN BATH) کہتے ہیں[1]۔ ان کے قول کی بنا پر یہ لفظ مانویت کی ایک خاص جماعت کیلئے تھا۔ پھر اس کا استعمال تمام مانویت پر ہونے لگا اور اس کے بعد علی العموم الحاد کے معنی میں مستعمل ہونے لگا۔ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ فرماتے تھے "تین آدمی تین چیزوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ جو نجوم کی پیروی کرتا ہے وہ زندقہ سے نہیں بچ سکتا۔ جو کیمیا کی تلاش کرتا ہے وہ فقر سے نہیں بچ سکتا اور جو عجیب و غریب حدیثیں تلاش کرتا ہے وہ جھوٹ سے نہیں بچ سکتا۔"[2]

ج۔ مزدک

۴۸۷ء کے لگ بھگ فارس میں مزدک کا ظہور ہوا۔ طبری کہتا ہے کہ یہ نیشاپور کے رہنے والے تھے اور اس نے ایک نئے ثنوی (دو خداؤں کے قائل) مذہب کی طرف دعوت دی۔ یہ بھی نور اور ظلمت کے قائل تھے لیکن ان کا سب سے بڑا مابہ الامتیاز ان کی اشتراکی تعلیمات ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ تمام انسان پیدائشی اعتبار سے مساوی ہیں لہذا انھیں مساویانہ طور پر ہی زندگی بھی گذارنی چاہیئے۔ جن چیزوں میں سب سے زیادہ مساوات برتنی ضروری ہے وہ مال اور عورتیں ہیں۔ شہرستانی کا بیان ہے کہ مزدک لوگوں کو ایک دوسرے کی مخالفت کرنے، آپس میں بغض و حسد رکھنے اور لڑنے سے منع کرتے تھے۔ چونکہ اکثر یہ مخالفت اور بغض و جنگ عورتوں اور اموال کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے انھوں نے عورتوں کو حلال اور اموال کو مباح قرار دے دیا تھا اور لوگوں کو ان میں اس طرح شریک کر دیا تھا جیسا کہ وہ پانی، آگ اور گھاس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ طبری کا بیان ہے کہ "مزدک اور ان کے ساتھی کہتے تھے کہ خدا نے زمین میں رزق اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ بندے اس رزق کو مساوی طور پر برادرانہ تقسیم کر لیں۔ لیکن لوگوں نے ایک دوسرے پر ظلم کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ مالداروں سے فقیروں کیلئے مال وصول کرتے ہیں اور دولت مندوں سے لیکر غربا میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور جس کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال، عورتیں اور سامانِ تنعم موجود ہے وہ اس کا دوسروں سے زیادہ مستحق نہیں ہے۔ کمینہ لوگوں نے ان تعلیمات کو آڑ بنا لیا اور غنیمت سمجھا۔ یہ لوگ مزدک اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مل گئے اور تمام ملک ایک ابتلا میں گرفتار ہو گیا۔ ان کی قوت بڑھتی گئی حتیٰ کہ یہ لوگ کسی کے گھر میں گھس جاتے اور اس کے مکان، عورتوں اور اموال پر قبضہ کر لیتے۔ قباذ کو بھی انھوں نے ان تعلیمات کا گرویدہ بنا لیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کا ساتھ نہ دیا تو وہ اسے معزول کر دیں گے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ کوئی شخص اپنے بچہ کو نہیں پہچانتا تھا اور کوئی بچہ اپنے باپ کو نہیں پہچانتا تھا اور کسی کے پاس اتنا نہ رہا کہ وہ فراغبالی کی زندگی گذار سکے۔" طبری دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ مزدک نے جس امر کا لوگوں کو حکم دیا اور گرویدہ بنایا اور جس امر پر برانگیختہ کیا وہ اموال اور بیویوں میں مساوات کا نظریہ تھا۔ مزدک کہتے تھے کہ یہی وہ نیکی ہے جسے خدا پسند فرماتا ہے اور جس پر بہترین ثواب دیتا ہے۔ اگر یہ امر جس پر وہ انھیں برانگیختہ کر رہے ہیں دین میں سے نہ بھی ہو تب بھی یہ شرافتِ کردار اور باہمی تراضی اور مساوات کا موجب تو ہے ہی۔ . . . . . الخ"[3]

اس سے ہمیں نظر آجاتا ہے کہ مزدک کی اشتراکی تعلیمات دنیا کی قدیم ترین اشتراکی تعلیمات میں سے ہیں۔ استاد "نولڈکہ" کہتے

---

[1] ملاحظہ ہو "براؤن" ـــــ [2] العقد الفرید ج ۱ ص ۱۹۹ ـــــ [3] تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۸ وما بعد۔

ہیں کہ "جو چیز مزدک کو جدید اشتراکیت سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا دینی رنگ ہے جس میں انھوں نے اپنی تعلیمات کو رنگ لیا تھا۔" اس کے علاوہ کچھ دوسری روحانی تعلیمات بھی تھیں۔ وہ قناعت اور زہد کی تعلیم دیتے تھے اور حیوانوں کو حرام قرار دیتے تھے کہ ان کو ذبح نہ کرنا چاہیئے۔

ہزار ہا لوگوں نے ان کا مذہب قبول کر لیا۔ لیکن قباذ نے ان کو اور ان کے متبعین کو قتل کر دیا اور ان کے لئے ایک مذبح بنانے کی ترکیب کی اور ۵۲۳ء کے لگ بھگ قریب قریب ان کا استیصال ہی کر دیا۔

اس کے باوجود کچھ لوگ ان کے مذہب کی پیروی کرتے رہے حتیٰ کہ اسلام کے بعد بھی اصطخری اور ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ کرمان کے بعض دیہاتی دولتِ امویہ کے عہد تک مزدکیت کے پیرو تھے۔

صرف مالی جہت میں ہمیں ابوذر غفاری کی رائے اور مزدک کی رائے میں بڑی ہی مشابہت نظر آتی ہے۔ طبری بیان کرتے ہیں کہ "ابوذرؓ شام میں کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہنا شروع کر دیا "مالدارو! فقیروں کی غمخواری کرو۔ ان لوگوں کو خوشخبری دیدو جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے کھلا نہیں چھوڑ دیتے کہ جہنم میں اس سونے چاندی سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پشتیں داغی جائینگی" وہ یہی کچھ کرتے رہے حتیٰ کہ فقراء اور محتاج لوگ اس جیسی باتوں پر فریفتہ ہونے لگے اور مالداروں کے خلاف نفرت کے جذبات ابھرنے شروع ہو گئے حتیٰ کہ مالداروں نے شکایت کی کہ انھیں لوگوں کی طرف سے ایذائیں مل رہی ہیں۔" پھر حضرت معاویہؓ نے ابوذر غفاریؓ کو حضرت عثمان کے پاس مدینہ منورہ بھیجدیا کہ کہیں وہ ان کے خلاف اہل شام کو خراب نہ کر دیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ "اہل شام کو کیا ہوا، وہ تمہاری زبان درازی کی شکایتیں کرتے ہیں۔" تو ابوذرؓ نے جواب دیا کہ "مالداروں کو مال جمع نہیں کرنا چاہیئے۔" اس سے تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی رائے اموال کے بارہ میں مزدک کی رائے کے بہت قریب تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ رائے ابوذرؓ تک کیسے پہنچی؟ طبری نے اس سوال کا جواب بھی بہم پہنچایا ہے[1]۔ وہ کہتے کہ ابن السوداء ابوذر غفاریؓ سے ملا اور انھیں ان باتوں سے برافروختہ کیا اور یہی ابن السوداء ابودرداءؓ اور عبادہ بن الصامتؓ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، لیکن ان دونوں نے اس کی باتیں نہیں سنیں بلکہ عبادہ تو اسے پکڑ کر امیر معاویہؓ کے پاس لیگئے اور ان سے کہا کہ بخدا یہی وہ شخص ہے جس نے ابوذر غفاریؓ کو تمہارے خلاف ورغلایا تھا[2]۔

ہمیں معلوم ہے کہ ابن السوداء وہ لقب ہے جو عبداللہ بن سبا کو دیا گیا تھا۔ یہ صنعاء کا ایک یہودی تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسلام ظاہر کیا اور اس کا مقصد مسلمانوں پر ان کے دین میں فساد ڈالنا تھا۔ اس نے مختلف شہروں میں ایسے مضر عقائد پھیلا دیئے جن کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ یہ بہت سے شہروں میں گھومتا رہا، حجاز، بصرہ، کوفہ، شام، مصر وغیرہ

---

[1] اگر فاضل مصنف اس سوال کے جواب کے لئے طبری کی بجائے قرآن کی طرف رجوع کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ حضرت ابوذرؓ نے یہ خیال خود قرآن ہی سے لیا تھا اور ان کے دلائل بھی قرآنی آیات ہی پر مبنی تھے۔ (طلوع اسلام)

[2] طبری ج ۵ ص ۶۶ وما بعد۔

قریبی احتمال ہے کہ اس نے یہ نظریہ عراق یا یمن کی مزدکیت سے لیا ہو۔ اور ابوذرؓ نے اپنی اعتقادی نیک نیتی سے اسے قبول کر لیا ہو اور اسے اپنے زہد کے رنگ میں رنگ لیا ہو جس کی طرف ان کی طبیعت کا شروع سے میلان تھا۔ کیونکہ وہ صحابہ میں متقی اور پرہیزگار ترین اور دنیا میں زاہد ترین شخصیت شمار کئے جاتے ہیں۔ اور وہ ان محبوب ترین شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے صوفیت پر بھی بہت کافی اثر ڈالا ہے۔

اہل فارس کے دینی عقائد سے قریب تر جس کا اثر بعض مسلمانوں نے بھی قبول کیا ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ وہ اپنے بادشاہوں کی طرف اس نگاہ سے دیکھتے تھے گویا کہ وہ کائنات الٰہیہ (کائناتی دیوتاؤں) میں سے ہیں جنھیں خدا نے لوگوں پر حکومت کرنے کیلئے منتخب فرمایا ہے۔ اور انھیں سیادت و امارت کے ساتھ ممتاز کر کے روح الٰہی کے ساتھ ان کی تائید فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ زمین پر اللہ کا سایہ ہیں جسے خدا نے اپنے بندوں کی مصالح کے لئے قائم فرمایا ہے۔ لوگوں کے ان پر کوئی حقوق واجب نہیں ہوتے البتہ لوگوں پر بادشاہوں کا یہ حق واجب ہے کہ وہ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ یہ اسی قسم کا نظریہ ہے جو یورپ میں حق الٰہی (DIVINE RIGHT) کے نام سے مشہور تھا۔ اور سولہویں اور سترہویں صدی میں جس کی سیادت وہاں قائم رہی۔ استاد براؤن کہتے ہیں کہ "حق الٰہی کے اس نظریہ نے کبھی وہ قوت حاصل نہیں کی جیسا کہ فارس میں سلاطین ساسانیہ کے عہد میں اس نے حاصل کر لی تھی۔ اکاسرہ یہ خیال کرتے تھے کہ صرف انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تاج شاہی پہن سکیں کیونکہ ان کی رگوں میں خدائی خون گردش کر رہا ہے"۔ استاد "نولدکہ" نے اہل فارس کے اس نظریہ کو قبول کر لینے پر جو دلیل دی ہے وہ ایک حکایت ہے جو کتاب "الاخبار الطوال" میں نقل کی گئی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ بہرام چوبین (جو شاہی خاندان سے نہ ہوتے ہوئے طلبگار حکومت تھا اور جس نے کسری پرویز سے جنگ کی تھی اور جسے کسریٰ نے شکست دی تھی اور وہ بھاگ گیا تھا ـــــ بھاگتے ہوئے راستہ میں ایک گاؤں پر وہ گذرا اور شب گذاری کیلئے مع اپنے ساتھیوں کے اس گاؤں میں ایک بڑھیا کے مکان میں اس نے قیام کیا۔ ان لوگوں نے کھانا نکال کر کھایا اور جو بچ گیا وہ بڑھیا کو کھلا دیا۔ پھر شراب نکالی تو بہرام نے بڑھیا سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی شراب پینے کیلئے برتن بھی ہے؟ بڑھیا نے کہا کہ ہاں میرے پاس ایک چھوٹا سا کدو ہے بڑھیا وہ کدو لے آئی انھوں نے اسے کاٹ کر اندر سے گودا نکال کر پیالہ بنا لیا اور اس میں شراب پینا شروع کر دی پھر کچھ نقل نکالا اور بڑھیا سے کہا کہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں یہ نقل رکھ لیں؟ تو بڑھیا ایک چھوٹی سی چھلنی لے آئی۔ اس چھلنی میں ان لوگوں نے نقل کو رکھ لیا۔ بہرام نے حکم دیا اور بڑھیا کو بھی شراب نوشی میں شریک کر لیا گیا۔ بہرام نے بڑھیا سے پوچھا "بڑی بی! تمہارے پاس کوئی نئی خبر بھی ہے"؟ بڑھیا نے کہا "ہاں مجھے یہ خبر ملی ہے کہ کسری روم سے اپنی فوجیں لیکر آ گیا ہے اور بہرام سے جنگ کر کے اسے اس نے شکست دیدی ہے اور اس سے اپنا ملک واپس لے لیا ہے"۔ بہرام نے بڑھیا سے پوچھا کہ "بہرام کے بارہ میں تم کیا کہتی ہو" بڑھیا نے جواب دیا کہ "وہ تو نرا احمق اور جاہل ہے، شاہی خاندان سے ہے نہیں اور بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے"۔ بہرام نے کہا کہ "جب ہی تو وہ کدو میں شراب پیتا اور چھلنی میں نقل کھاتا ہے"۔ چنانچہ فارسی میں یہ ضرب المثل مشہور ہو گئی۔

ہماری رائے میں یہ کوئی قوی استدلال نہیں ہے کیونکہ ہر حاکم خاندان جب چند نسلیں حکومت میں گذار لیتا ہے تو وہ ہر قوم کے

عوام میں اس حق کو اپنے لئے حاصل کرلیتا ہے۔ خواہ وہ اپنے بادشاہوں کی تقدیس کے قائل نہ بھی ہوں۔

اس رائے کی تائید میں اس سے کہیں بہتر وہ بیان ہے جو کتاب "التاج" میں موجود ہے کہ "سلاطین ساسانیہ کو ان کی رعایا نے کبھی اپنے شعر، خطبہ، تقریظ یا کسی دوسرے موقعہ پر نہ ان کے ناموں سے یاد کیا نہ ان کی کنیتوں سے۔ یہ بات سلاطینِ حیرہ کے ہاں آکر پیدا ہوئی۔

اس سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ بادشاہ اپنے آپ کو بہت ہی اونچا لیجاتے تھے اور قوم بھی ان کو اسقدر اونچا سمجھتی تھی کہ لوگوں کی زبانوں پر ان کے نام یا ان کی کنیتوں کا آجانا حتیٰ کہ اشعار میں بھی سخت بے ادبی اور گستاخی شمار کی جاتی تھی۔

یہ تھے اہلِ فارس کے دینی مذاہب، جو فتوحاتِ اسلامی کے بعد مملکت اسلامی میں سرایت کرگئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے اور اپنے ان عقائد سے جو پشتہا پشت سے وراثتاً ان میں چلے آرہے تھے خود کو جدا نہیں کرسکے اور زمانے گزر جانے کے ساتھ ساتھ ان کے پرانے نظریات اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے چنانچہ شیعوں کا نظریہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے بارہ میں قطعاً وہی ہے جو ان کے آباواجداد کا نظریہ ساسانی بادشاہوں کے بارہ میں تھا۔ اہل فارس کی ثنویت (دو خداؤں کا نظریہ) وہ سرچشمہ ہے جس سے اسلام میں رافضیت سیراب ہوتی چلی آرہی ہے جسے معتزلہ نے رافضیوں وغیرہ کے دلائل کے رد کرنے کیلئے مزید حرکت دی۔ اس پر اتنا اضافہ اور کرلیجئے کہ زردشت، مانی اور مزدک کی تعلیمات مسلمانوں میں مختلف ادوار میں مختلف شکلوں میں برابر اپنی نمود کرتی رہیں چنانچہ دولت امویہ کے آخری زمانہ میں اور دولت عباسیہ میں اس نے کافی سر نکالا اور مسلمان مجبور ہوئے کہ ان سے مناظرے کریں اور ان کے دلائل کو رد کرکے خود اپنے دین کی تائید منطق اور برہان سے کریں۔

ان مسائل کا ابھرنا کبھی کبھی خود مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کردیتا تھا چنانچہ یہ خود مختلف مذاہب میں بٹ جاتے اور آپس میں جھگڑنے لگ جاتے تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے اسلام میں علم کلام کو پیدا کیا جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

معراجِ انسانیت

معارف القرآن جلد چہارم

ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینہ میں جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں تقریباً دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائناتؐ جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط حسین۔ گرد پوش مرصع و دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صحِ بہار کے عنوانات منقش و رنگین۔ قیمت بیس روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس ۷۳۱۳۔ کراچی

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

قارئین کو یاد ہوگا کہ حیدرآباد دکن کی "اکاڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز" کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ شائع ہوا تھا جسے ہم نے طلوعِ اسلام کی اپریل ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں عنوانِ بالا کے تحت شائع کیا تھا اور اس پر اپنا تبصرہ بھی لکھا تھا۔ اس مراسلہ میں اکاڈیمی نے تجویز یہ پیش کی تھی کہ تمام ممالک اسلامیہ کے اہلِ علم حضرات پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی جائے جو احادیث کے مجموعوں کا از سرِ نو جائزہ لے اور اس کے بعد صحیح حدیثوں کا ایک الگ مجموعہ شائع کرے۔ اس پر طلوعِ اسلام نے جو تبصرہ کیا تھا اسے آپ (اپریل ۱۹۵۴ء کے پرچہ میں) ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرما لیجئے تاکہ آپ کی یاد تازہ ہو جائے۔

اب اکیڈیمی کی طرف سے (انگریزی زبان میں) ایک اور پمفلٹ موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے ان جوابات کا جائزہ لیا ہے جو انھیں ہندوستان، پاکستان، اور دیگر اسلامی ممالک کے اربابِ فکر و نظر کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ اب کرنے کا کام کیا ہے۔

اس پمفلٹ میں انھوں نے بتایا ہے کہ ان حضرات کو جن کے جوابات موصول ہوئے ہیں چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو احادیث کے موجودہ مجموعوں کو علی حالہ رہنے دینا چاہتے ہیں اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کو جائز نہیں سمجھتے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک سارے کا سارا ذخیرہ وضعی اور رد کر دینے کے قابل ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسلئے کہ دین کے لئے قرآن کافی ہے۔

تیسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہمیں صرف اسلام کی روح کو لے لینا چاہئے اور قرآن یا احادیث میں بیان کردہ احکام و قوانین کو خیرباد کہہ دینا چاہئے۔ اور

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ایک طرف روایتی اسلام کے تقدس کے بھی قائل ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مغرب کی تجدد پسندی بھی اختیار کر لیں۔

یہ چوتھا گروہ وہ ہے جس کے متعلق اکیڈیمی نے لکھا ہے کہ وہ اکیڈیمی کے ہمنوا ہیں اور چاہتے ہیں کہ حدیثوں کے مجموعوں کی از سرِ نو چھان بین کی جائے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ان حضرات کی طرف سے اکیڈیمی کو کیا جوابات موصول ہوئے اور ان جوابات کی روشنی میں گروہوں کی یہ تقسیم صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن کم از کم ایک صاحب کا جواب تو ہمارے سامنے ہے اور اس جواب کی روشنی میں ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ

نہ ہی ان کا شمار صحیح گروہ میں ہوا ہے اور نہ ہی ان کے مسلک کی وضاحت ہوئی ہے۔ بلکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ جو لوگ صرف اس پمفلٹ سے ان کے مسلک کا اندازہ لگائیں گے وہ کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ جواب محترم پرویز صاحب کا ہے جن کے نظریہ سے قارئین طلوع اسلام اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں گروہِ ثانی میں شمار کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بہتر ہوتا کہ اکیڈیمی ان تمام جوابات کو بجنسہ شائع کر دیتی جو انھیں موصول ہوئے تھے اور یہ چیز قارئین پر چھوڑ دیتی کہ وہ ان جوابات سے خود نتائج اخذ کر لیں۔ ہمارے لئے یہ دشوار ہے کہ ہم محترم پرویز صاحب کا پورے کا پورا جواب یہاں نقل کر دیں۔ (عدم گنجائش اس کی مانع ہے) ہم ان کے جواب کا ملخص پیش کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ پرویز صاحب کا جواب ہے بلکہ اس لئے کہ حدیث کے متعلق یہ ایک مخصوص طرزِ فکر کا ترجمان ہے اور ہمارا خیال ہے کہ حدیث کے بارہ میں جب تک ان خطوط پر نہیں سوچا جائے گا اسلام کو موجودہ مشکلات سے نکالنے کی کوشش بارآور نہیں ہو سکے گی۔

محترم پرویز صاحب کے جواب کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) حضور نبی اکرم صلعم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بدبختی سے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہو چکی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہ چیزیں وضعی روایات کی پیدا کردہ ہیں اور جب تک ہم انھیں اپنی تاریخ سے الگ نہیں کر دیں گے، حضور صلعم کی صحیح سیرت سامنے نہیں آسکے گی۔ ایسا کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اسلئے کہ حضورؐ کی سیرت قرآن کے عین مطابق تھی اور قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ لہذا سیرت کے متعلق ہر وہ روایت جو قرآن کے خلاف ہو اور جس سے حضور کی شان میں طعن پایا جاتا ہو اس قابل ہے کہ اسے مسترد کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ گوشہ جس میں محترم پرویز صاحب کے نزدیک حدیث کے ذخیرہ پر تنقید و تنقیح کی ضرورت ہے اور یہی وہ گوشہ ہے جس میں اکیڈیمی کی مجوزہ کوشش درخورِ ستائش ہے۔ اسی نظریہ کے ماتحت خود پرویز صاحب نے اپنی معرکہ آرا کتاب (معراج انسانیت) لکھی ہے جس میں سیرت نبی اکرم کو خالص قرآن کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ دین کے قوانین اور احکام کے بارہ میں حدیث کی پوزیشن کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے محدودے چند احکام کی جزئیات متعین کی ہیں، باقی قوانین ایسے ہیں جن کے صرف اصول بیان کئے ہیں۔ یہاں سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو احکام قرآن نے خود بیان کر دیئے ہیں، کیا حدیث کی رو سے ان میں اضافہ یا ردو بدل کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً قرآن نے کھانے پینے کی چند چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور احادیث میں ان چیزوں کے علاوہ اور چیزوں کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ اضافہ کی مثال ہے یا قرآن نے ہر شخص کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرے اور جو مال وصیت سے بچ جائے یا جس کے متعلق وصیت نہ کی جا سکی ہو اس کی تقسیم کے لئے اس نے حصے مقرر کر دیئے ہیں لیکن حدیث میں ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں کی جا سکتی ہے اور وہ بھی رشتہ داروں کے لئے نہیں۔ یہ ردو بدل کی مثال ہے۔ سوال یہ ہے کہ حدیثوں میں جو اس قسم کے اضافے یا قرآنی احکام میں ردو بدل پایا جاتا ہے کیا وہ قرآن ہی کی طرح واجب الاطاعت قوانین ہیں؟ اگر یہ واجب الاطاعت نہیں تو ان حدیثوں کے

پرکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہ واجب الاطاعت ہیں تو اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ قرآن کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اسلئے کہ یہ یا تو قرآن پر اضافے ہیں یا اس کے احکام میں ردوبدل۔

دوسرا سوال ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ قرآن میں زکوٰۃ کا حکم ہے لیکن نہ اس کا کہیں نصاب دیا گیا ہے نہ شرح۔ حدیثوں میں زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرح کے احکام ملتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ کے متعلق یہ جزئی احکام جو احادیث میں ملتے ہیں قیامت تک کیلئے غیر متبدل ہیں تو آپ کو انھیں علی حالہ صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ قرآن کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اور اگر یہ صرف وقتی احکام تھے تو ان کی بابت احادیث کو پرکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

محترم پرویز صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کے احکام میں اضافہ یا ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہو سکتا اور جن چیزوں کو قرآن نے محض اصولاً بیان کیا ہے ان کی بابت اس کا منشاء یہ نظر آتا ہے کہ ملت کا جو نظام علیٰ منہاج نبوت قرآنی قوانین کے نافذ کرنے کے لئے قائم ہو وہ اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ان کی جزئیات میں ردوبدل کر سکتا ہے اس کیلئے ان کی دلیل یہ ہے کہ

(۱) اگر ان جزئیات کو غیر متبدل رکھنا ہوتا تو انھیں خود اللہ تعالیٰ متعین کر دیتا۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے ان احکام کی جزئیات کو متعین فرمایا لیکن ان کا کوئی مستند مجموعہ مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا بلکہ صحابہ کو ان کے لکھنے سے بھی روک دیا۔ اگر رسول اللہ صلعم کا یہ منشا ہوتا کہ یہ جزئیات قیامت تک کیلئے دین کے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے رہیں تو دین کے آخری پیغامبر ہونے کی حیثیت سے آپ کا فریضہ تھا کہ قرآن کی طرح ان جزئیات کا مستند مجموعہ امت کو دیتے۔

(۳) خلفائے راشدین نے بھی ان جزئیات کا کوئی مجموعہ مرتب نہ فرمایا اور یہ نہیں کہ یہ بات سہواً رہ گئی ہو بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سوال خاص طور پر زیر بحث آیا۔ قریب مہینہ بھر تک مجلس شوریٰ نے اس پر غور و فکر کیا اور اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسا مجموعہ مرتب نہیں کرنا چاہیئے۔

ہمیں افسوس ہے کہ زیر نظر پمفلٹ میں نہ تو محترم پرویز صاحب کا پورا جواب نقل کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے مذکورہ بالا نظریہ کو وضاحت سے پیش کیا گیا ہے بلکہ انھیں گروہ ثانی میں شامل کر کے انھیں ان لوگوں کے زمرے میں شمار کر دیا گیا ہے جن سے ان کا مسلک الگ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مسلک مخصوص ہے اور ان ہر چہار گروہ سے الگ۔ پھر اکیڈیمی نے اتنا ہی نہیں کیا کہ جن لوگوں نے اکیڈیمی کے نظریہ کے خلاف کوئی مسلک پیش کیا ہے ان سے صرف اختلاف کا اظہار ہی کیا ہو۔ اس نے ان نظریوں پر تنقید بھی کی ہے اور اپنی دانست میں انھیں باطل بھی ٹھہرایا ہے۔ ہمارے نزدیک اکیڈیمی کے لئے یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ وہ اپنے نظریہ کو صحیح قرار دے اور اس کے خلاف نظریوں کی از خود تردید شروع کر دے۔ اس تردید میں جس قسم کے دلائل دیئے گئے ہیں اس کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس نکتہ کے متعلق کہ رسول اللہ صلعم نے ان جزئیات کا مستند مجموعہ امت کو کیوں نہ دیا لکھا ہے کہ

اگر رسول اللہؐ کے پاس دوسری مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات کا مجموعہ مرتب

فرمادیتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا منشا یہ تھا کہ آپ کے بعد ان جزئیات میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ ایک رسول کی زندگی کا بنیادی اور اولین فریضہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ امت تک دین کو پہنچائے۔ اسی لئے قرآن نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسلتہ (۵/۶۷) "اے رسول جو کچھ تجھ پر نازل کیا جاتا ہے تو اسے لوگوں تک پہنچا دے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے فریضۂ رسالت ہی کو ادا نہیں کیا"۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی رسول کو (اور رسول بھی ایسا جس کے بعد کسی نبی نے آنا ہی نہیں) اس کی زندگی کی دوسری مصروفیات اتنی فرصت نہ دیں کہ وہ دین کے غیر متبدل احکام و قوانین کو محفوظ شکل میں امت تک پہنچا دے تو کیا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس رسولؐ نے اپنے فریضۂ رسالت کو خدا کے ارشاد کے مطابق ادا کر دیا؟ پھر اگر (معاذ اللہ) رسول اللہؐ کو اس کی فرصت نہیں ملی تھی تو کیا صحابہؓ کو بھی اس کی فرصت نہیں تھی کہ وہ دین کے اتنے اہم حصہ کو مرتب اور محفوظ کر لیتے درآنحالیکہ امام ابن حزم کے قول کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قرآن کے کم از کم ایک لاکھ نسخے مختلف شہروں میں موجود تھے۔ باقی رہا یہ کہنا کہ اس سے رسول اللہ کا منشا یہ نہیں تھا کہ ان کی تشریف بری کے بعد ان جزئیات میں تبدیلی ہو سکتی ہے تو اس کا کیا جواب ہے کہ یہ تبدیلیاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شروع ہو گئی تھیں اور انھوں نے یہ کہہ کر تبدیلیاں کی تھیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے اور ہمارے زمانے کے حالات میں فرق آچکا ہے۔

اس کے بعد اکیڈمی نے لکھا ہے کہ

> جیسا کہ پرویز صاحب نے کہا ہے اعمال و اقوال رسول اللہ صلعم کے متعلق جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ صحیح اور غلط کا مجموعہ ہے۔ لیکن یقیناً یہ ناممکن نہیں کہ اس سے صحیح کو الگ کر کے قرآن کے مطابق کر لیا جائے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکیڈمی اس کام کو ناممکن نہیں سمجھتی۔ یہ دکھانے کیلئے کہ اکیڈمی نے یہ بات محض رسمی طور پر کہدی ہے ہم ان سے صرف ایک حدیث کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط اور قرآن کے مطابق ہے یا خلاف۔ حدیث میں ہے کہ چاندی اور سونے میں زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصدی ہے۔ اکیڈمی سے درخواست ہے کہ وہ بتائے کہ

(۱) یہ فیصلہ خود رسول اللہ صلعم کا ہے یا نہیں۔ اگر رسول اللہ کا ہے تو اس کی یقینی سند کیا ہے؟ (واضح رہے کہ سند کے یہ معنی نہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اسلئے کہ خود اکیڈمی نے لکھا ہے کہ احادیث کی جانچ پڑتال متون سے کی جائیگی نہ کہ اسناد سے۔ لہٰذا از روئے متن یہ بتایا جائے کہ یہ رسول اللہؐ کی حدیث ہے یا نہیں۔)

(۲) یہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر قرآن کے مطابق ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

اکیڈمی نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں عبادات کو معاملات سے الگ کر لینا چاہئے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ معاملات میں تو تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن عبادات میں نہیں۔ ہم اکیڈمی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ

(۱) ان کے پاس عبادات اور معاملات کی اس تفریق کیلئے سند کیا ہے؟

(۲) کیا ان کے نزدیک (مثلاً) زکوٰۃ عبادات میں شامل ہے یا معاملات میں؟

(واضح رہے کہ اکیڈمی خود ہی دوسرے مقامات پر لکھتی ہے کہ "قرآن کا اسلام توجہ کی یکسوئی (CONTEMPLATION) کا مذہب نہیں۔ نہ ہی رسومات (RITUAL) کا۔ اس میں قانون اور مذہب میں کوئی فرق نہیں۔")

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ محترم پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق اسلامی نظام انہی جزئیات میں تبدیلی کریگا جن کی تبدیلی کے لئے زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات متقاضی ہوں گے۔ اب ظاہر ہے کہ حالات کی وہ کونسی تبدیلی ہوگی جس کا تقاضا یہ ہوگا کہ نماز میں سورۃ "فاتحہ" کی جگہ سورۃ "الناس" پڑھی جائے یا پہلے سجدہ کیا جائے اور بعد میں قیام۔ یہی وجہ ہے کہ نہ محترم پرویز صاحب نے اور نہ ہی طلوع اسلام نے آجتک کبھی نماز میں کسی تبدیلی کے متعلق اشارۃ تک بھی کیا ہے۔ البتہ طلوع اسلام یہ ضرور کہتا ہے کہ رسول اللہ کے نقشِ قدم پر جو قرآنی نظام قائم ہو وہ امت میں وحدت پیدا کرنے کیلئے موجودہ اختلافات کو مٹا کر نماز کی ایک متفقہ علیہ شکل قائم کر سکتا ہے۔ اور نیز اس روح کو واپس لا سکتا ہے جس کے نہ ہونے سے ہمارے یہ اجتماعاتِ صلوٰۃ بے جان رسم بن کر رہ گئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اپریل ۱۹۵۴ء کے طلوع اسلام میں لکھا تھا۔ ہم اکیڈمی کو مشورہ دیں گے کہ اگر انھوں نے فی الواقعہ کوئی مفید کام کرنا ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے ذہن میں حدیث کی پوزیشن کے متعلق ان اصولی اور بنیادی امور کو متعین کر لیں جن کی طرف محترم پرویز صاحب نے اپنے جواب میں توجہ دلائی ہے اور جنھیں ہم نے مختصر الفاظ میں اوپر دہرایا ہے۔ جب تک آپ اس پوزیشن کے متعلق اپنے ذہن کو صاف نہیں کر لیں گے آپ کا کوئی قدم صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکے گا۔ ہر اس شخص کو جو اپنے دل میں کسی اصلاح کا جذبہ رکھتا ہے اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

معاملہ کی باتیں

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا کارڈ آنا ضروری ہے ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف۔

(۲) خط و کتابت میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

حقائق و عبر

(۱) یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ

دسمبر کے مہینہ کا سب سے بڑا جگر سوز، کرب انگیز، ہوش ربا اور ہولناک سانحۂ فاجعہ مصر میں اخوان المسلمین کے رہناؤں اور اراکین کا بے محابا قتل ہے، جنھیں سازش کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ پاکستان ہی سے نہیں بلکہ قریب قریب تمام اسلامی ممالک سے اس کے خلاف احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں لیکن حکومتِ مصر نے اِن میں سے کسی پر بھی کان نہ دھرا۔ ہمیں اس واقعہ سے اسقدر صدمہ گذرا ہے کہ ہم پر کئی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ لیکن اس صدمہ سے متاثر ہونے اور اس کے خلاف لب کشائی کرنے کیلئے ہماری وجوہات ان سب سے مختلف ہیں جن کی بنا پر دوسرے لوگوں اور اداروں کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ پاکستان میں (جیسا کہ ظاہر ہے) اس باب میں جماعتِ اسلامی سب سے پیش پیش رہی۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے جو امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنے متعدد بیانات میں پیش کئے۔ مثلاً انھوں نے عبدالقادر عودہ کے سلسلہ میں کہا:

> ان شہداء کی فہرست میں عبدالقادر عودہ کا بھی نام ہے۔ ان جیسا متبحر عالم شاید صدیوں میں بھی پیدا نہ ہو سکے۔ انھوں نے فقہ اسلامی اور دیگر قوانین کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس موضوع پر بڑی گراں بہا کتابیں لکھی ہیں۔ اس قسم کی گراں پایہ ہستی کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دینے سے حکومتِ مصر نے ملت اسلامیہ کے دل میں ناسور پیدا کر دیئے ہیں۔ (ڈان ۹ ردسمبر ۱۹۵۴ء)

یہی وہ دلیل ہے جو جماعتِ اسلامی اور ان کے ہمنواؤں نے ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی سزا پر پیش کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ مودودی صاحب ایک جید عالم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اسلئے حکومت کو چاہئے کہ انھیں بلاشرط رہا کر دے۔ ہم نے اسوقت بھی کہا تھا اور اب پھر دہراتے ہیں کہ یہ دلیل بے حد کمزور ہے۔ اگر کسی شخص نے فی الواقعہ ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا صحیح قانون کی رو سے موت ہے تو اس شخص کو محض اس بنا پر اس سزا سے نہیں بچایا جا سکتا کہ وہ شخص بڑا عالم اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ جرائم کی سزائیں صرف جہلا اور گمنام لوگوں کیلئے رہ جائیں اور مشاہیر اور علماء جو جی میں آئے کرتے پھریں، انھیں کوئی پوچھے ہی نہیں۔

ہم نے مودودی صاحب کی سزا کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا اسے ہم آج پھر دہراتے ہیں۔ ان سزاؤں کے خلاف ہماری دلیل یہ نہیں کہ سزا پانے والے لوگ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور جید عالم ہیں۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ جن فوجی عدالتوں میں اور جس افراتفری سے ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت کے بعد انھیں سزائیں دی جاتی ہیں، ان سے نہ قانون کا منشاء پورا ہوتا ہے نہ عدل و انصاف کا تقاضا۔ سب سے پہلی چیز تو یہ کہ فوج میں تربیت ہی اس انداز کی ہوتی ہے کہ وہ لوگ اس انداز سے حالات کا جائزہ لینے اور ان پر غور و فکر کرنے کے قابل نہیں ہوتے جس طرح ایک باقاعدہ ملکی عدالت کا جج کر سکتا ہے۔ فوجی عدالتیں، فوج کا ڈسپلین قائم رکھنے کا کام دیکھتی ہیں

لیکن عام شہریوں کے مقدمات سننے اور صحیح فیصلہ دینے کی اہل نہیں ہوسکتیں۔ ہمارا اعتراض یہ تھا اور اسی کو اب ہم پھر دہراتے ہیں کہ یہ چیز حکماً بند ہوجانی چاہئے کہ غیر فوجیوں کے مقدمات کی سماعت فوجی عدالتیں کریں۔ اگر کہیں حالات ایسے پیدا ہوجائیں کہ فوجی عدالتوں کے سوا چارۂ کار ہی نہ رہے تو اس صورت میں بھی ایک تو فوجی عدالتوں کو سزائے موت دینے کے اختیارات نہیں ہونے چاہئیں اور دوسرے ان کے فیصلوں کی اپیل ملک کی عام عدالتوں میں ہونی چاہئے۔ جن افراد یا اداروں نے مصر کے اس حادثہ پر اسقدر اضطراب کا اظہار کیا ہے ہم ان سے درخواست کرینگے کہ وہ نہایت استقامت سے اس مسئلہ کا تعاقب کریں اسے "یو این او" تک لیجائیں اور وہاں سے یہ احکام جاری کرادیں کہ حقوقِ انسانیت میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی غیر فوجی کے مقدمہ کی سماعت فوجی عدالت نہ کرے۔ اور اگر وہ سماعت کرے تو بہرحال اس کی اپیل ملک کی سول کورٹ میں ہوسکے۔ اگر ایسا ہوجائے تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

۲۔ مفتیوں کے فتوے

نومبر کی آخری تاریخوں میں ایک مقدمہ کی روئیداد شائع ہوئی ہے جو کراچی کی ایک عدالت میں فیصل ہوا ہے۔ بات مختصراً یہ تھی کہ قریب سات سال ہوئے ایک بالغ عورت کی شادی ایک شخص کے ساتھ ہوئی۔ غالباً میاں بیوی میں کچھ ان بن تھی۔ انھوں نے مفتی محمد شفیع صاحب کی طرف رجوع کیا۔ مفتی صاحب نے فتویٰ دیدیا کہ سابقہ نکاح فسخ ہوچکا ہے۔ چنانچہ لڑکی کے باپ اور بھائیوں نے اسکی شادی ایک دوسری جگہ کردی۔ لڑکی کے پہلے خاوند نے استغاثہ دائر کردیا اور عدالت نے ان سب کو عقدِ ثانی کے جرم میں سزا دیدی۔ یہ عقدِ ثانی ملک کے قانون کے خلاف تھا۔ اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام جاہل اور مذہب پرست ہیں وہ عام طور پر ملک کے قانون سے واقف نہیں ہوتے اور نکاح طلاق وراثت وغیرہ کے معاملات میں شریعت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ سمجھتے ہیں۔ جب کوئی مفتی انھیں اس کا فتویٰ دیدیتا ہے کہ فلاں چیز شریعتِ حقہ کی رو سے جائز ہے تو وہ بلا توقف اسپر عمل پیرا ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا وہ عمل قانون کے خلاف ہوتا ہے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں اگر غور کیا جائے تو ان واقعات میں اصل مجرم وہ مفتی ہوتا ہے جو انھیں اسکا فتویٰ دیدیتا ہے کہ جاؤ تمہیں اجازت ہے کہ شریعت کی رو سے ایسا کرلو۔ لیکن مفتی صاحب یہ کہہ کر الگ ہوجاتے ہیں (جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے عدالت سے کہا کہ) "موجودہ حکومت کے آئین میں ان کے فتوے کی کوئی قیمت نہیں"۔ اور جو ناواقف انکے فتوے کو باقیمت سمجھ کر اس کے مطابق عمل کرلیتے ہیں وہ سزا بھگتتے ہیں۔ یہ صورتِ حالات بڑی خرابیوں کی موجب اور حکومت کی فوری توجہ کی مستحق ہے۔ جب ان مفتیوں کے فتوے کی کوئی قیمت ہی نہیں تو یہ فتوے دیتے ہی کیوں ہیں؟ اور انھیں فتویٰ دینے ہی کیوں دیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یا تو ان فتووں کو حکماً روکدینا چاہئے اور یا اس قسم کا قانون بنادینا چاہئے کہ اگر کوئی مفتی ایسا فتویٰ دیگا جو ملک کے قانون کے خلاف ہو تو اس جرم کی سزا مفتی کو دیجائیگی نہ کہ ان لوگوں کو جنھوں نے اسکے فتویٰ کے مطابق عمل کیا تھا۔

یہ سب شوشے اسوقت تک ہیں جبتک ملک میں قرآنی نظام رائج نہیں ہوتا۔ اسوقت نہ موجودہ ٹائپ کے مفتیوں کی ضرورت رہیگی اور نہ کبھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ ملک کا قانون کیا ہے اور شریعت کا فیصلہ کیا۔ اسوقت ملک کا قانون اور شریعت ایک ہی چیز ہوگی اور اس کا انتظام حکومت کے ذمہ ہوگا کہ وہ ہر مستفسر کو بتائے کہ معاملہ متعلقہ میں قانون کیا ہے۔ ملا کی موت میں ملت کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

۳۔ خزائن و دفائن

کچھ عرصہ ہوا حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی کہ وہ تحقیقات کرے کہ ملک میں لوگوں نے کسقدر دولت دبا رکھی ہے جنھیں مفید کاموں میں نہیں لگایا جارہا۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق دو ارب اور تین ارب روپے کے درمیان لوگوں نے دبا رکھا ہے جو کسی

مصرف میں نہیں آرہا۔ چنانچہ ہر صاحبِ فکر پریشان ہے کہ جس ملک کی اس قدر دولت اس طرح بیکار پڑی ہو وہ ملک اقتصادی ترقی کس طرح کر سکتا ہے یہ صورتِ حالات فی الواقعہ پریشان کن ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس خرابی کا باعث کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ اس کا باعث ہے عدم تحفظ (IN-SECURITY) کا احساس یعنی یہ احساس کہ نہ معلوم کل کو کیا ہو جائے۔ اسوقت پیسہ وہی کام میں آئیگا جو اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ جب تک کوئی فرد اپنے آپ کو معاشرہ میں محفوظ نہیں سمجھتا۔ روپیہ جمع کرنے کا جذبہ اس کے دل سے جا نہیں سکتا۔ قرآن نے روپیہ جمع کرنے والوں کی سزا جہنم لکھی ہے اور جہنم کفار کا ٹھکانا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے روپیہ جمع کرنا اور مسلمان ہونا دو متضاد چیزیں ہیں۔ لیکن قرآن یہ حکم اسوقت دیتا ہے جب پہلے ایسا نظام قائم کر دیتا ہے جسمیں ہر فرد معاشرہ اور اس کی اولاد کی تمام ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر پر ہوتی ہے۔ اس نظام میں ہر فرد کو اس پر یقین ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے پسماندگان ضروریاتِ زندگی سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے۔ اس نظام کے قیام کے بعد روپیہ جمع کرنا، جائدادیں خریدنا، زمینیں سنبھالکر بیٹھ جانا سب ناجائز قرار پاجاتا ہے۔ جس حد تک کوئی معاشرہ اس نظام کی طرف بڑھیگا۔ اسی حد تک اس کے افراد اپنی دولت کو اجتماعی مفاد کے کاموں میں لگاتے چلے جائیں گے اور ملکوں کو تو عقل کی تجرباتی دشواریوں کے بعد کہیں جاکر یہ چیزیں سمجھ میں آئی ہیں لیکن مسلمانوں کو زبانِ وحی نے از خود یہ بتا رکھا ہے۔ لیکن بدبختی ملاحظہ ہو کہ آج مسلمان تمام اقوام عالم کے مقابلہ میں اس نظام سے سب سے زیادہ دور ہیں اور یہ اسلئے کہ مُلّا اسے بتا دیتا ہے کہ اگر اس روپیہ میں سے چالیسواں حصہ مجھے دیدو تو باقی سب عذاب حلال اور طیب ہو جائیگا۔

۴۔ بھلا بتائیے تو! اس عبارت کو پڑھئے:۔

اقاصیص و روایت والی کتابوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ہمارے علماء انہی کے عادی ہیں۔ ان کو اندازہ ہی نہیں کہ قرآن کو دنیا اب کس طرح سمجھنا چاہتی ہے۔ خدا کی بات، خدا ہی کی بات کی حیثیت سے سمجھ میں آئے۔ مطالبہ اس کا بڑھ رہا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ روایتوں کے بغیر قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی دوسری راہ ہی نہیں۔

اس عبارت کو آپ کسی مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیجئے۔ وہ تین چار گالیوں کے بعد نہایت غضب آلود انداز میں کہیگا کہ یہ وہی ملحد، بے دین، منکر حدیث طلوعِ اسلام ہے جو اس فتنہ کو پھیلا رہا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے رسول اللہ صلعم کی حدیثوں کی بھی ضرورت نہیں لیکن آپ حیران ہونگے کہ یہ عبارت کسی منکر حدیث کی نہیں۔ یہ اقتباس ہے ایک خط کا جو سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا اور جو اخبار صدق لکھنؤ کے ۳ دسمبر کے پرچہ میں شائع ہوا۔ خط لکھنے والے اور مکتوب الیہ دونوں کٹر قسم کے مولوی ہیں لیکن آپ دیکھئے کہ زمانہ کے تقاضے کس طرح مار مار کر ان لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف لا رہے ہیں لیکن طلوعِ اسلام کا نام آپ ان لوگوں کے سامنے بھی لے دینگے تو یہ ناک بھوں چڑھانے لگ جائیں گے محض اسلئے کہ طلوعِ اسلام غیر مولویوں کا پرچہ ہے اور مولوی صاحبان کسی غیر مولوی کو اس کا حق دینے کیلئے تیار نہیں کہ وہ مذہب کے معاملہ میں لب کشائی کر سکے۔ خدا کی بات، خدا کی بات کی حیثیت سے سمجھنے کا دعویٰ طلوعِ اسلام نے ہی کیا۔ دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ بات سمجھا کر بھی بتا دی۔ لیکن حرام ہے جو کسی مولوی کو اتنی توفیق نصیب ہوئی ہو کہ اس کے اعتراف میں اس نے ایک لفظ بھی کہا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ خدا کی کتاب کو اقاصیص و روایات کے چنگل سے نکالکر قرآن کو قرآن سے سمجھانے کی جو کوشش اولین میں سے سید محب الحق مرحوم اور علامہ سالم جیراجپوری اور ان کے بعد طلوعِ اسلام کے صاحب فکر محترم پرویز صاحب نے کی ہیں ہماری تاریخ کے کسی دور میں بھی اتنا کچھ نہیں ہوا ہوگا لیکن اسکے باوجود مولویوں کی طرف سے ان کے حصہ میں گالیوں کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔ لیکن خدا کی کتاب کی قوت دیکھئے کہ اب مولوی خود وہیں آرہا ہے ✤

اسلام

عصر حاضر میں

[طلوع اسلام کی نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں "شرعی قوانین کی تجدید" کے عنوان سے ایک مقالہ قارئین کی نظر سے گذر چکا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مختلف اسلامی ممالک میں ان قوانین کی جکڑ بندیوں کو ڈھیلا کرنے کیلئے جنھیں فقہ اور روایات نے غیر متبدل قرار دے رکھا ہے کس اضطراب کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے ایک کتاب آئی جو اسی سال شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے اسلام (ISLAM) اور اس کے لکھنے والے ہیں پروفیسر الفریڈ گیلام (ALFRED GUILLAUME) یہ وہی فاضل مستشرق ہے جس نے (THE LEGACY OF ISLAM) جیسی کتاب کو ایڈیٹ کیا تھا۔ اس کتاب کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مصنف کی زیر نظر کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے "اسلام ــــ عصر حاضر میں"۔ اس میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جہاں تک شرعی قوانین کا تعلق ہے ان پر نظر ثانی کرنے کے سلسلہ میں مختلف اسلامی ممالک میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی افادیت کے پیش نظر ہم اس کا ترجمہ شائع کرتے ہیں جو ہمارے محترم دوست احمد محی الدین انصاری صاحب ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے رشحات قلم کا مرہون ہے فاضل مصنف کی نگاہ قرآن پر نہیں اسلئے کہ انھوں نے قرآن کو لامحالہ مروجہ تفاسیر ہی کے ذریعہ سے سمجھا ہے۔ اسلئے قرآن کے بارہ میں وہ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ لیکن بایں ہمہ جس موضوع سے انھوں نے بحث کی ہے وہ اہم اور مفید ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ طلوع اسلام]

مجھے تو کسی ایسے شخص کا علم نہیں ہے جسے سارے اقطاع عالم کے غیر معروف گوشوں میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کا تو کیا کم از کم ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں مسلمانوں کے متعلق ہی ایسی قابلِ وثوق معلومات حاصل ہوں کہ وہ اسلام پر بہ حیثیت مجموعی کوئی قابل اعتماد بیان دے سکے اور یہ ظاہر ہے کہ ادھوری اور ناقص معلومات کی بنا پر عام طور پر رائے زنی کرنا کس قدر خطرناک اور گمراہ کن ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ زمانہ حال کے مسلمانوں نے خود اپنے مذہب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر غور کیا جائے اور اپنے دیکھے سنے ذاتی معلومات سے اس واقفیت کو مکمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسی کوشش سے ممالکِ اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ پر کچھ روشنی پڑ جائیگی۔ لیکن پھر بھی اکثر قابلِ لحاظ گوشے تاریکی میں رہ جائیں گے اسلئے کہ جن خطوں کے مسلمانوں کے متعلق نہ ابھی تک کچھ لکھا گیا ہے اور نہ ہی وہ خود اس قابل ہیں کہ اپنے متعلق کچھ بیان کر سکیں۔ ان کے بارے میں کوئی باوثوق رائے دینا ممکن نہیں ہوگا۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ حال کے مسلمانوں پر جدید اکتشافاتِ سائنس، نئے فلسفہ اور نئی تنقیدِ تاریخی کا کس حد تک اثر پڑا ہے

جواب اس کا غالباً یہی ہوگا کہ صرف وہی افراد جنھوں نے مغربی روایات کی جامعات میں تعلیم پائی ہے اور ان مسائل کا کچھ وقوف رکھتے ہیں، ان سے کچھ اثر اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اتنی کم بھی نہیں جسے بآسانی نظر انداز کر دیا جاسکے۔ ان لوگوں سے گفتگو کی جائے تو اکثر ایسے نظر آئیں گے جو قرآن کے بارے میں کوئی کٹرپن نہیں ظاہر کرتے اور روایات و حدیث کے متعلق بھی ایک عمیق تنقیدی زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اور بعض نے تو جیسا کہ آگے چل کر بتلایا جائیگا حدیث کے بارے میں نہایت بیباکی سے صاف صاف رائے ظاہر کر دی ہے۔ لیکن جہانتک قرآن کا تعلق ہے اسے ایک انسانی تصنیف مان لینا خواہ وہ انسان الہامِ خداوندی (وحی) سے بہرہ مند ہی کیوں نہ ہو ان کی جرات سے باہر ہے۔ علما کی قوت اور اقتدار سے وہ بہت مرعوب اور خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ قرآن کے حرفاً و لفظاً لفظاً کلامِ الٰہی ہونے میں اگر انھوں نے ذرہ برابر بھی شک و شبہ کا اظہار کیا تو نہ صرف آئندہ سرکاری ملازمتوں اور ترقیوں کی راہیں ان کے لئے مسدود ہو جائیں گی بلکہ موجودہ عہدوں کی بھی خیر نہیں[51]۔ چنانچہ مصر کے ایک بڑے مدبر اور جید عالم طٰہٰ حسین کی مثال ان کے سامنے موجود ہے۔ اپنی ایک تصنیف میں انھوں نے حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ کے مکہ میں تشریف لانے کے واقعہ میں شبہ ظاہر کیا تھا اس کی پاداش میں انھیں جامعہ کی خدمت سے معزول کر دیا گیا ان کی بین الاقوامی شہرت اور اعلیٰ علم و تبحر کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا اور ایک عرصہ کے بعد بمشکل انھیں اپنے عہدہ پر بحالی نصیب ہوئی[52]۔ ایک ایسے جید عالم و فاضل سے جس کی حب الوطنی اور ملک کی ترقی کا جوش و انہماک ملک میں ہر جا پر سو مانا ہوا ہو جب ایسا برتاؤ کیا جائے تو ان کمتر درجہ کے بے وسیلہ لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو اپنی عقل اور ضمیر کی پیروی کرنے کا ارادہ کریں[53]۔

مشرقی ممالک کے صدر مقامات پر آج ہر شخص ان کی فضا میں ہوائی جہاز اور سڑکوں پر موٹریں چلتی دیکھتا ہے۔ ان دونوں صبار فتار سواریوں کے ہم دوش انہی سڑکوں پر اونٹ بھی نہایت اطمینان اور بے خوفی سے مصروفِ خرام نظر آتا ہے۔ اسے اس کا مطلق خیال نہیں گذرتا کہ سواریوں اور راہروؤں میں اس کی بے پروا خوش خرامی خلل انداز ہو رہی ہے یا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ اسی طرح ذہنی اور عقلی مسائل میں بھی ترقی پسند، ذی فہم افراد نئے اندازِ فکر اختیار کر کے ان سے استفادہ کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی قدامت پرست مُلا جو عوام کے قلب و دماغ پر حکمرانی کرتا ہے اب تک اپنے اسلاف کی فرسودہ تعلیمات کو طوطے کی طرح رٹانے میں مشغول ہے۔ میں نے خود ۱۹۱۷ء میں مصر کی جامعۂ ازہر میں دیکھا کہ طالب علموں کو جغرافیہ کا سبق (جدید نقشوں کے بجائے) قدیم جغرافیہ دانوں کے مرتب کئے ہوئے ایک پرانے نقشے کی مدد سے دیا جا رہا تھا۔ یہ تو خیر ایک پرانی بات ہے ابھی ابھی ۱۹۵۰ء میں اسی جامعہ کی مسجد میں میں نے گرامر کا ایک سبق سُنا جو کئی سو سال پہلے کی ایک

---

[51] جو مناصب یا فرائض مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں وہ ایسے لوگوں کو نہیں دیئے جاسکتے۔ اسلئے کہ قرآن کو انسانی تصنیف مان لینے کے بعد کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس معاملہ میں مداہنت یا رعایت برتنے والی مملکت' اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ (طلوع اسلام)

[52] ہمیں معلوم نہیں کہ طٰہٰ حسین کو کس جرم کی پاداش میں جامعہ سے الگ کیا گیا تھا اور پھر کن حالات میں انھیں اپنے عہدے پر بحال کیا گیا تھا۔ (〃)

[53] قرآن عقل و ضمیر کی پیروی پر پابندی عائد نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر تم دین کے محکمات میں سے (جو اجزائے ایمان ہیں) کسی سے انکار کرتے ہو، یا اس کی صداقت میں تمہیں شبہ ہے تو تمہارا مقام غیر مسلموں کی صف میں ہے۔ جو حقوق انھیں حاصل ہیں وہی تمہیں حاصل ہونگے۔ (طلوع اسلام)

کتاب صرف و نحو کی مدد سے رٹایا جارہا تھا۔ انھیں اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ زبانِ عربی کی خصوصیات و فضائل کے اظہار کیلئے جو کوششیں اس انداز سے کی جارہی ہیں وہ سامی زبانوں کے حالیہ تحقیقی مطالعوں کے سامنے بالکل ہیچ اور ناکارہ بلکہ بعض پہلوؤں سے گمراہ کن ثابت ہوچکی ہیں یہ نظریہ یکسر غلط ہے اور اس کے نتائج بیکار۔

قدامت پرستی

امورِ دنیوی ہوں یا مسائل مذہبی ہیں، اور یوں دیکھو تو ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں، اگر کوئی شخص اصلاح کا بیڑا اٹھائے تو اسے روایت و قدامت کی ایک زبردست قوت کا مقابلہ کرکے تعطل و بے عملی کا سنگِ گراں اپنی راہ سے ہٹانا پڑتا ہے کیونکہ یہاں صرف قابلیت اور علم و فضل ہی کا سوال نہیں۔ روٹی کا مسئلہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کبھی ایک نیا طریقِ تعلیم و تعلم اختیار کیا جائے گا۔ پرانے طریقِ تعلیم کے اساتذہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور انھیں ایسے لوگوں کیلئے جگہ خالی کردینی ہوگی جو نئی تعلیم کے لوازمات سے آراستہ ہوں۔ اسلئے کوئی تعجب نہیں کہ ان لوگوں کو جو سوسائٹی کے پرانے جسد میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں ایک شدید اور زبردست مخالفت سے دوچار ہونا پڑے کیونکہ ان کثیر التعداد ملاؤں، مفتیوں، قاضیوں وغیرہ کا کیا بندوبست ہوگا جو بیکار بیٹھ جانے پر مجبور ہوں گے؟ اور اگر ایک بار یہ مان لیا جائے کہ موجودہ شریعت یا فقہ حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد کی مرتب کی ہوئی چیز ہے اور محض مقدس اور محترم بنانے کیلئے اسے پیغمبر صلعم سے منسوب کردیا گیا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ایک بڑا گروہ جس نے اس کے طفیل صدیوں تک اپنی قوم کے قلب و دماغ پر حکومت کی ہے کسی اور پیشہ کی تلاش پر مجبور ہوگا یا زاویۂ گمنامی میں جا پڑیگا۔[1] ہوسکتا ہے کہ ان میں سے اکثر دیانتداری کے ساتھ اپنے منصب اور کام کے تقدس اور اپنی صلاحیتوں کا اعتقاد رکھتے ہوں لیکن ان سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ مغربی اندازِ فکر اور طریقِ مطالعہ کو جو مشرقی مذاہب اور مشرقی طریقِ حیات پر کڑی تنقید کرتا ہے بے چون و چرا اختیار کرلیں گے۔ ہم لوگوں کیلئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ اور اصلاحِ عام کے دور میں ہم اس سے بھگت چکے ہیں۔ اسلام بھی غالباً ایک اصلاحی دور کی دہلیز پر کھڑا ہوا ہے لیکن وہ لوگ بھی جو کسی نہ کسی اصلاحی اقدام کی ضرورت محسوس کررہے ہیں یورپ کے دورِ اصلاحی کے بعد خود عیسائیت میں جو مذہبی فرقہ بندیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے بھڑک جاتے ہیں۔

---

[1] یہ مصیبت پاکستان میں ابھی سے نازک صورت اختیار کرچکی ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت، ہندوستانی مسلمان جوق در جوق پاکستان کی طرف آنے شروع ہوگئے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ان میں مختلف پیشوں کے لوگ تھے جنھوں نے یہاں پہنچکر اپنے اپنے پیشے اختیار کرلئے۔ لیکن مذہبی پیشواؤں (مساجد کے ائمہ۔ مذہبی مدرسوں کے اساتذہ۔ قاضی، مفتی وغیرہ) جو یہاں پہنچے تو ان کیلئے یہاں جگہ ہی نہ تھی۔ مساجد سب پُر تھیں۔ ہندو اور سکھ جو اپنی عبادتگاہوں کو خالی کرگئے تھے وہ انھیں الاٹ نہیں کی جاسکتی تھیں۔ کام انھیں کوئی آتا نہیں تھا۔ اب سوچئے کہ بیکاروں کا اتنا بڑا طبقہ جس نے وہاں ایسی زندگی بسر کی تھی کہ لوگ دیتے بھی تھے اور ہاتھ بھی چومتے تھے وہ یہاں کس طرح گذر اوقات کرتا۔ پاکستان کیلئے یہ مسئلہ (PROBLEM) بڑا غور طلب تھا چنانچہ ہم نے اسی زمانے میں اربابِ حل و عقد کی توجہ اس طرف منعطف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر اس طبقہ کی معاش کا بندوبست نہ کیا گیا تو یہ قسم قسم کے فتنوں کا موجب بن جائیگا۔ افسوس کہ اربابِ اقتدار نے اس طرف توجہ نہ دی نتیجہ جس کا یہ ہوا کہ ملک ابتری اور پریشانی کی آماجگاہ بنادیا گیا۔ اس مصیبت کا اب بھی یہ حل ہے کہ اس طبقہ کے جو لوگ اسوقت ملک میں بیکار ہیں ان کی معاش کا انتظام کیا جائے اور آئندہ کیلئے یہاں مذہبی مدرسے بالکل نہ کھلنے دیئے جائیں تاکہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ باقی رہی دینی تعلیم سو اس کا انتظام عام اسکولوں اور کالجوں میں کیا جائے۔ اگر قوم نے اب بھی اس طرف توجہ نہ دی تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو انڈونیشیا۔ ایران۔ مصر وغیرہ میں ہورہا ہے۔ (طلوعِ اسلام)۔

حدیث و روایات کا اعتبار اور تقدس جو مسلمانوں کی زندگی میں روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے یوں تو کوئی ایک ہزار سال پیشتر ہی تنقید کا ہدف بننا شروع ہو گیا تھا[1] مگر ان دنوں اس پر ایک تازہ حملہ شروع ہو گیا ہے اور نتیجۃً بہت سی پرانی باتیں ترک کر دی گئی ہیں۔ مغربی لباس بھی آزادی سے اختیار کیا جا رہا ہے جو پرانی شریعت کی خلاف ورزی ہے اور حج و زکوٰۃ صدقات و خیرات کے پرانے طریقے اب چند ہی لوگوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ یہی وہ اہم تبدیلیاں ہیں جو مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں نظر آ رہی ہیں۔ تاہم قدامت پرستی کا دیو بھی سخت جان ہے اور اب تک مرا نہیں۔ چنانچہ خود میرے ایک شاگرد کا یہ تلخ تجربہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ وہ ایک طلائی انگشتری پہنا کرتا تھا جو اس کے باپ نے اسے تحفۃً دی تھی۔ ایک امام نے دیکھ کر اسے بہت صلواتیں سنائیں۔ کیونکہ ایک حدیث کی رو سے ایسی اشیاء کا استعمال ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ اس نے امام کا برا بھلا سُن لیا مگر اپنی عزیز انگوٹھی کو جدا کرنا گوارا نہ کیا۔ خیر یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ صرف روایات و حدیث کے متعلق زمانۂ حال کے مسلمانوں کے تصورات ہی میں نہیں بلکہ قانون کے عملی دائرے میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں[2]۔ اب انہی دو امور کی طرف ہم متوجہ ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں روایاتِ قدیم پر جدید تاریخی تنقید کے اثرات کے متعلق ایک واضح اور بے لاگ رجحان کیلئے ہمیں صرف پاکستان کو دیکھ لینا چاہئے یوں تو تعلیم و تعلّم کے متعلق ایک جدید تصور بہت پہلے سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے پیش کیا اور اسے اختیار کرنے پر زور دیا۔ اور ایک

سرسید احمد خاں

ایسے کالج کو بنانے اور چلانے کی کوشش کی جہاں مغربی تخیل اور مغربی اندازِ فکر کی خوبیاں ایک اسلامی ماحول میں مسلمانوں کے ذہن نشین کرائی جائیں۔ چنانچہ موجودہ علیگڈھ یونیورسٹی ان ہی کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اسلام اور سائنس میں کوئی بیر و عناد ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اس پر زور دیتے رہے کہ اسلام نیچر کے عین مطابق ہے۔ اسلئے انھوں نے اسلام کے معجزاتی عنصر سے بھی یکسر انکار کر دیا اور مُلّاؤں کی شدید مخالفت کا پورا بوجھ برداشت کرتے رہے۔ جس مدرسہ کی انھوں نے بنیاد ڈالی تھی اس کے اثرات مہتم بالشان اور عظیم ہوئے۔ از انجملہ کثرتِ ازدواج، طلاق اور غلامی جیسی معاشرتی خرابیوں پر مخلص مسلمان سنجیدگی سے غور کرنے لگے اور انھیں روایاتی طریقِ زندگی اور اس کی اسناد کے متعلق ایک ناقدانہ رجحان اختیار کرنا پڑا۔

سید امیر علی

ان کے بعد سید امیر علی آئے جو فرقۂ شیعہ کے عالم تھے۔ ان کی تصنیف "اسپرٹ آف اسلام" سارے اسلامی ممالک میں بڑے شوق ذوق سے پڑھی جاتی ہے جس میں وہ علما کی تعبیر و تفسیر کے بغیر قرآن کے بالراست مطالعہ کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں یہ ساری تفسیریں اسلاف کی غیر مستند تعلیمات پر مبنی ہیں۔ کثرتِ ازدواج کو بھی وہ قرآنی سند سے مطعون ٹھہراتے ہیں جس کی رو سے اگرچہ وقتِ واحد میں چار بیویوں کی حد تک اجازت دی گئی ہے مگر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص متعدد بیویوں کے ساتھ مساوات و عدل نہیں کر سکتا اسلئے اسے ایک ہی

---

[1] امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف "کتاب الام" میں "منکرینِ حدیث" کی ایک طویل بحث نقل کی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] یہ تبدیلیاں "منکرینِ حدیث" ہی کی طرف سے نہیں ہو رہیں بلکہ حدیث پر ایمان رکھنے والوں کی طرف سے بھی ہو رہی ہیں۔ اس کی زندہ شہادت پاکستان کی اسلامی جماعت ہے۔ یہ اپنی ہر نئی تحریر اور تقریر میں حدیث کے متعلق اپنے سابقہ موقف سے ہٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی متعین طور پر نہیں بتا سکتا کہ آئین یا قوانین کے سلسلے میں حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ہم اس بات کو ذہنی قیاس نہیں لکھ رہے۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ کسی ایک جگہ واضح طور پر لکھیں کہ اس باب میں حدیث کا یہ مقام ہے۔ اور ہم بتائیں گے کہ یہ خود اس سے پہلے اس مقام کے خلاف کیا کچھ کہہ چکے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

بیوی پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جذباتِ انسانی کے معاملہ میں چونکہ عدل و مساوات ممکن ہی نہیں اسلئے قرآن کی اس اجازتِ مشروط کو تعددِ ازدواج کی ممانعت ہی تصور کرنا چاہیئے۔ (میری اس کتاب کا مقصد اگر مناظرہ و مباحثہ ہوتا تو میں یہ پوچھتا کہ جب شرط کی تکمیل ناممکن تھی تو شرط عائد ہی کیوں کی گئی اور کثرتِ ازدواج کو صراحتاً ممنوع کیوں نہیں کر دیا گیا اور جواز کی صورت رکھی ہی کیوں[۱]؟) مسلمان جو آجکل اس قعرِ مذلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کا سبب وہ یہ بتلاتے ہیں کہ ماضی کے جکڑ بندنے ان کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور آزادیٔ فکر و خیال سلب کر لی ہے۔ آخر میں انھوں نے اپنی یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ اسلام کے علما و فضلا کی ایک مؤتمر اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دے کہ غلامی کی طرح کثرتِ ازدواج بھی منشائے اسلام کے منافی اور متضاد ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آزادیٔ فکر اور حقِ اجتہاد کو وہ علما ہی کی حد تک محدود رکھنے کے حامی ہیں۔ پردہ یعنی عورتوں کو علیحدہ رکھنے کی رسم کے متعلق ان کا خیال تھا کہ بمقتضائے حالات حضور اکرمؐ نے عارضی طور پر اسے اختیار کیا تھا اور ہمیشہ کے لئے اسے ایک دستورِ معاشرہ قرار دینا مقصود نہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں کہیں اس کا ذکر بھی نہیں[۲]۔ یہ مصلح اپنی آزاد خیالی میں یہانتک بڑھ گیا ہے کہ دوسرے اس کی پیروی میں تامل اور پس و پیش کرنے لگے ہیں۔ حتیٰ کہ خود قرآن کو اس نے حضور اکرمؐ کی تصنیف قرار دیدی ہے[۳]۔ اور اگرچہ اکثر مسلمان کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں[۴]۔ اور گفتگو میں صاف اعتراف بھی کر لیتے ہیں مگر مجھے زمانۂ حال کے کسی ایسے مسلمان مصنف کا علم نہیں جس نے اپنی تحریر میں ان سے اتفاق کیا ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی تاریخی وجہ اس اعتراف میں مانع ہو کیونکہ قرآن کے غیر مخلوق یعنی حرفاً و لفظاً کلام اللہ ہونے کا عقیدہ تیسری صدی ہجری تک ثابت نہیں کیا گیا تھا[۵]۔ علاوہ ازیں مجھے اس میں بھی شبہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی بڑی تعداد امیر علی کی اس رائے کی حمایت کر سکے گی کہ حضرت مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کے عقیدہ کے سوا، اسلام اور عیسائیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بعد کی صدیوں میں اسلام نے جو شکل اختیار کر لی اس کی بہ نسبت قرآن عیسائیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔

اقبالؒ امیر علی کے بعد ایک عظیم شخصیت سر محمد اقبال (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۳۸ء) کی آتی ہے۔ وہ ایک بڑے شاعر تھے اور فارسی و اردو

---

[۱] فاضل مقالہ نگار کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے اور سید امیر علی اور ان جیسے اور حضرات کا معروضی انداز غلط۔ قرآن نے تعددِ ازدواج کی اجازت دی ہے لیکن صرف انہی حالات میں جب معاشرہ میں کسی وجہ سے مثلاً جنگ وغیرہ سے یہ صورت پیدا ہو جائے کہ یتیموں اور بیواؤں کی تعداد بہت بڑھ جائے اور ان کی حفاظت اور پرورش کا تقاضا ہو کہ انھیں اجزائے خاندان بنا لیا جائے۔ عدل کی شرط کے ساتھ صرف انہی حالات میں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجازت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ یعنی اس بات کا فیصلہ معاشرہ کو کرنا ہوگا کہ ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ قرآن میں ایسے حالات کے علاوہ اور کسی صورت میں تعددِ ازواج کی اجازت نہیں۔ (طلوع اسلام)

[۲] قرآن، عورت کی بیباکی کو روکتا ہے لیکن اسے چار دیواری میں محبوس رکھنے یا لحافوں میں لپیٹنے کا حکم نہیں دیتا۔ (ؒ)

[۳] اس وقت ہمارے سامنے 'اسپرٹ آف اسلام' نہیں ہے۔ لیکن اگر سید امیر علی نے واقعی یہ کہا ہے تو اس سے ان کا اسلام باقی نہیں رہ سکتا (ؒ)

[۴] جو ایسا عقیدہ رکھتا ہے وہ قرآن کی رو سے مسلمان نہیں ہے۔ (ؒ)

[۵] فاضل مصنف کو مسئلہ خلق و قدم قرآن کے سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ جو لوگ قرآن کو مخلوق کہتے تھے ان کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ وہ رسول اللہؐ کی تصنیف ہے۔ یہ دونوں گروہ قرآن کو منزل من اللہ اور وحی خداوندی مانتے تھے۔ (طلوع اسلام)

ہر دو میں شعر کہتے اور فلسفیانہ مضامین انگریزی میں لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے اپنے چھ لکچرز "اسلامی فکرِ مذہبی کی تشکیل جدید" کے عنوان سے شائع کئے۔ اگرچہ اقبال کا ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر بہت کچھ اثر پڑا ہے لیکن اس میں شبہ ہے کہ انھوں نے جس چیز کو تشکیلِ جدید کا نام دیا ہے وہ فی الحقیقت تشکیل جدید متصور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب وہ جزئیات اور تفصیلات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی عبارت نہایت صاف اور واضح ہوتی ہے لیکن جب وہ عام اصول سے بحث کرتے ہیں تو تصوف اور شاعری ان کی تحریر پر غالب آجاتی ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے نظریوں کا ماحصل آخر ہے کیا؟ یہ تصور بھی درست نہ ہوگا کہ ان کی تصنیف الغزالیؒ کے احیاء العلوم سے جس میں مسلمانوں کے عقائد و اعمال، ان کی حیات باطنی اور مقاصد و عزائم کی ایک منظم اور مربوط تصویر نظر آتی ہے، کوئی مماثلت رکھتی ہے۔ ذیل میں ان کے لیکچروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لئے میں نے پروفیسر گب کی واضح تصنیف "اسلام کے جدید رجحانات" سے استفادہ کیا ہے۔

اقبال اس پر زور دیتے ہیں کہ زمانۂ حال کے مسلمانوں کو یورپ کے فکر و خیال کا مطالعہ کر کے یہ طے کرنا چاہئے کہ جن نتائج پر یورپ پہنچا ہے وہ اسلامی فکرِ مذہبی کی نظر ثانی اور بشرطِ ضرورت تشکیلِ جدید کے لئے کہاں تک مفید و کارآمد ثابت ہوں گے۔ لیکن اسلامی نظام پر نظر ثانی کرتے وقت ماضی سے بالکلیہ قطع تعلق مفید و مناسب نہ ہوگا۔ مگر جب وہ خود ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ روزمرہ کی عملی زندگی کا میدان چھوڑ کر صوفیانہ تخیل کے خیالی زاویہ میں پہنچ جاتے ہیں اور جب وہ قرآنی تعلیم کے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ وہ ایغوے انسانی کو تخلیقی آزادی سے بہرہ مند قرار دیتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدید فلسفیوں کے بعض نظریوں سے متاثر[1] اور روایتی اسلام سے دور جا پڑے ہیں۔ ہبوط و زوالِ آدم کے بارے میں ان کی تعبیر کچھ مسیحی علمائے حال ہی کی نہج کی ہے۔ یعنی یہ زوال نہیں بلکہ عروج تھا۔ ادنیٰ جبلّی خواہشات کے تابع و خوگر انسان کا ایک آزاد و ذی شعور شخصیت کے حصول کے لئے جوشہ اور انکار کی صلاحیت بھی رکھتی ہو اور بتدریج ایک ایسی کامل و رفیع الشان ایغو میں تبدیلی کا بھی جو حق اختیار و انتخاب سے بھی مستمد ہو۔ تقدیر کے معاملہ میں مسلمانوں کا اعتقاد، ان کے خیال میں، ایک اخلاقی ابتری ہے اور ایسے لوگوں کی ایجاد جنھیں فلسفیانہ حقائق کا کوئی ادراک نہیں۔ غرض ان کی رائے میں یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جسے مطلب پرستوں نے پیدا کیا اور غرض مندوں نے فروغ دیا ہے۔

جنت اور دوزخ کے متعلق ان کی تعلیم کچھ مانوس سی معلوم ہوتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

> دوزخ اور جنت محض کیفیات ہیں مقامات نہیں۔ قرآن شریف میں ان کا بیان ایک حقیقتِ باطنی کا مرئی بیان ہے۔ اس کے مفہوم میں دوزخ ایک دہکتی ہوئی آگ ہے جو انسان کے قلب پر مستولی ہو جاتی ہے یعنی ناکامی کا تلخ ترین احساس۔ اور جنت تحلیل و بربادی کی قوتوں کے مقابلہ میں کامرانی کی مسرت و انبساط کا نام۔ اسلام میں لعنتِ ابدی کوئی شے نہیں۔ اگرچہ دوزخ کے ساتھ قرآن کی بعض آیتوں میں ابدیت کا لفظ آیا ہے مگر اس کی قرآن نے خود توضیح کر دی ہے کہ وہ زمانہ کی ایک میعاد ہی ہے . . . . . .
>
> . . . قرآن کے تصور میں دوزخ اذیتوں اور عذابوں کا غار نہیں جو ایک خدائے منتقم کی طرف سے دیئے جا رہے ہوں بلکہ ایک شعورِ اصلاحی ہے۔

---

[1] یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس باب میں بعض جدید فلاسفہ قرآن کے اس تصور سے متاثر نظر آتے ہیں نہ یہ کہ اقبال جس نے اپنی فکر کا ماخذ قرآن کو قرار دیا ہے ان فلاسفروں کے تصور سے متاثر ہے۔ (طلوع اسلام)۔

جو ممکن ہے کہ سخت سے سخت الغو میں بھی رحمت خداوندی کے حیات بخش جھونکے کا پھر ایک بار ذوق و احساس پیدا کردے[1]۔ اسی طرح جنت بھی صرف آرام اور تعطل محض نہیں کیونکہ حیات صرف ایک ہے اور مسلسل۔ . . . . آزاد الغو کے ہر عمل سے ایک نیا ماحول عالم وجود میں آتا ہے اور تخلیقی مظاہرے اور انکشاف کے نئے نئے موقعے بہم پہنچتے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ باتیں کس خطرناک حد تک کفر کے قریب آگئی ہیں[2]۔ اقبال کی نظروں میں انسان خود ذات باری تعالیٰ کے ساتھ شریک کار ہے کیونکہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (۱۳/۱۱) اقبال کے نظریوں کے اس مختصر خلاصہ سے ناظرین پر واضح ہوگیا ہوگا کہ انھوں نے مسلمانوں کے لئے چند اصول مرتب کردیئے ہیں جو کسی حد تک آج کے مسیحی فکر و خیال سے مشابہ ہیں اور ایسی آیات قرآنی پر مبنی، جن کی کئی نسلوں سے مختلف تعبیر کی جاتی رہی[3]۔ لیکن یہ صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ جب ان کی تعبیر کے زمانۂ حال کے مقتضیات کے لحاظ سے عملی اطلاق کا سوال آتا ہے تو وہ راہ کترا جاتے ہیں کیونکہ انھیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ایسی مطابقت کا مسئلہ بڑا نازک ہے اور مصلح کی ذمہ داری نہایت گراں بار۔ اسلام نے صدیوں کے دوران میں ایک اجتماعی ضمیر اور مرضی عامہ پیدا کر رکھی ہے۔ اس لئے اس کے پیروؤں کو یہ تسلیم کئے بغیر گریز نہیں کہ کھانے پینے، نہانے دھونے، پاکی و ناپاکی کے بے ضرر معاشرتی مسائل میں تغیر و تبدل کا نہ ہو سکنا بھی کچھ نہ کچھ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ یہ مختلف النسل مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں بڑی حد تک ممد و معاون ہے۔ اسلئے قبل اس کے کہ اس میں کوئی دست اندازی کی جائے اس کی اہمیت و اثر کا اندازہ کرلینا بھی ضروری ہوگا پھر آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ائمہ فقہ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کے بعض وجوہ حتمی اور تعبیر میں مختتم اور قطعی ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ آج کے آزاد خیال مسلمانوں کی نسل کا جدید زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں بنیادی اصولِ قانون کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں تعبیر کرنے کے حق کا ادعا مجھے بالکل حق بجانب اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مشہور ترکی شاعر و ماہر عمرانیات ضیا گوک الپ نے ایک نظم لکھی تھی اور یہ سوال اٹھایا تھا کہ عورتوں کو قابل حقارت تصور کرنے کا شرع کو کیا حق حاصل ہے۔ طلاق۔ تفریق اور وراثت کے معاملات میں اسے مساویانہ حقوق کیوں نہ دیئے جائیں؟ اسپر اقبال کہتے ہیں کہ وہ یہ تو نہیں جانتے کہ شرع اسلام کی رو سے ان معاملات میں مساوات ممکن ہے یا نہیں لیکن انھیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے کٹر مسلمانوں کی قدامت پرستی کے مدنظر ججوں کو بھی مستند کتب کی پیروی سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اقبال کے ان جرأت آمیز اقوال کے مدنظر جو پہلے گذر چکے ہیں، اقبال کا اس طرح کا . . . . یہ عجز اور کمزوری حیرت خیز ہے۔ ایک عورت کو جس نے باپ کے ترکہ سے بھائی کے حصہ کا نصف ہی پایا ہو محض یہ کہدینا کوئی تسلی نہیں دیتا کہ اسلامی قانونِ وراثت میں مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں ہے[4] اور یہ تصور اسلامی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔ میری رائے میں اقبال یہاں قرآن کے اس واضح بیان کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

---

[1] ہمارے نزدیک یہ تعبیر قرآنی نہیں۔ قرآن جہنم کو اصلاحی تدبیر کہیں نہیں کہتا۔ اس کے نزدیک جہنم سلسلۂ ارتقا میں پیچھے رہ جانے کی حالت کا نام ہے اور جنت آگے بڑھ جانے کا۔ (طلوع اسلام)

[2] مُلّا کے اسلام کی رو سے۔ نہ کہ قرآن کی رو سے۔ (")

[3] یہ تعبیر روایات کے زیر اثر کی جاتی رہی ورنہ خالص قرآن کی رو سے یہ تعبیرات نئی نہیں ہیں۔ (")

[4] وراثت میں بھائی کی نسبت بہن کا حصہ اسلئے نصف ہے کہ عورت کسی منزل میں بھی ہو قرآن نے اسکی ضروریات زندگی کا کفیل مرد کو قرار دیا ہے۔ (")

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸)[1]

ایک مختصر سی نظم میں وہ کہتے ہیں:

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت ۔۔۔ نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود (ضربِ کلیم)

یہ مجھے ایک ایسے شخص کی دلدوز آہ معلوم ہوتی ہے جو رسم و رواج اور بزرگوں کی ریت کی زبردست قوتوں سے دست و گریباں ہونے سے عاجز ہو گیا ہو۔

[اس کے بعد مصنف نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ حدیث کی صحیح پوزیشن کے متعلق پاکستان میں کس قسم کی بحثیں چھڑ رہی ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین کا ذکر کیا ہے جو رسالہ اسلامک لٹریچر میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس حصہ کو حذف کر رہے ہیں اسلئے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قارئین طلوع اسلام کی نظروں سے نہ گذر چکی ہو۔ اگر طلوع اسلام انگریزی میں شائع ہوتا اور فاضل مصنف کی نگاہ سے اس میں پیش کردہ خیالات گذر جاتے تو انکو اس باب میں ایسی طویل گفتگو کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ بہرحال، اس کے بعد وہ ان تحریکات کا ذکر کرتے ہیں جن کی رو سے مختلف اسلامی ممالک میں تجدید فقہ کی اہمیت کا احساس بیدار ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:-]

تجدید فقہ

بعض ملکوں میں کچھ معاملات شرع کے دائرے سے خارج کر کے دنیوی عدالتوں کو ان کی سماعت کا اختیار دیدیا گیا ہے۔ اور جو بھی تبدیلیاں اسلامی ملکوں میں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں فی الجملہ گذشتہ ایک ہزار سال سے اب تک دیکھنے میں نہیں آئیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے ترکی نے شرعی قوانین کو کلیتہً خیرباد کہدیا ہے اگرچہ واقعتاً مذہب اسلام کے اثرات اس کے باشندوں پر عموماً اور ایشیائی حصہ میں خصوصاً خاطر خواہ گہرے ہیں اور نئے جمہوریہ دور میں بڑھتے ہی جائیں گے لیکن سرکاری طور پر وہ اب ایک غیر مذہبی حکومت بن گئی ہے۔

"ماڈرن ورلڈ" کے سلسلہ اداریات اور بعض دوسری تحریرات میں میرے شریک کار مسٹر اینڈرسن نے بتلایا ہے کہ عرب ملکوں میں کس طرح اسلامی شرع کی نظر ثانی ہو رہی۔ مصر، سوڈان، شام، لبنان اور عراق سب جگہ اس تحریک کا آغاز ہو گیا ہے جو تبدیلیاں ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کس طرح جدید زندگی کے تقاضوں اور انسانی تعلقات کے آزاد خیال اور روشن خیال پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کو جدید قانون سازی سے مطابق بنانے کی کامیاب کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کام اندھا دھند نہیں ہو رہا بلکہ کافی غور و خوض کے بعد تبدیلیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ اس دانشمندی و تدبر کیلئے یہ مصلحین مستحق صد ستائش ہیں۔ وہ تلاش و جستجو اور تحقیق کے اصول پر کاربند ہیں اور اپنے جدید خیالات کی حمایت کیلئے صرف چار بڑے مذاہب فقہ ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ امامیہ فرقوں اور ظاہریوں کی کتب سے بھی استفادہ کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ اس طرح ہر خطہ اور ہر ملک میں جو مذہب یا مکاتب فقہ رائج ہیں

---

[1] فاضل مصنف نے اس آیت کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ قرآن میں جس جگہ یہ آیت آئی ہے وہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ عورت عدت کے دوران میں شادی نہیں کر سکتی لیکن مرد کو حق حاصل ہے کہ اس دوران میں اسے واپس لے لے۔ بس یہ ایک درجہ ہے کہ جو مرد کو عورت پر حاصل ہے۔ اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن نے اسے بطور اصولِ کلی کے بیان کیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے، غلط ہے۔ (طلوع اسلام)

بجائے ان کا اتباع کرتے رہنے کے ایک بہترین انتخاب کے اصول پر نئی قانون سازی شروع کی گئی ہے جیسا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ طریقہ کوئی بدعت نہیں کیونکہ جہاں بعض مقننین کا یہ خیال ہے کہ جو شخص جس مکتب مذہبی میں پیدا اور بڑا ہوا ہے اسے ہمیشہ اسی کا پیرو رہنا چاہیئے۔ دوسرے اسے یہ حق دیتے ہیں کہ جز جز تو نہیں لیکن اگر وہ چاہے تو کلیتہً اپنا فقہی مذہب تبدیل کر سکتا ہے پھر ایک جماعت ایسی ہے جو جدید انتخابی طریق کی حمایت کرتی ہے، اپنی تائید میں کچھ سابقہ نظائر بھی رکھتی ہے اور اس پر قائم ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جملہ مسائل میں کسی ایک مکتب کا تابع مقلد رہنے کے بجائے بعض مسائل میں کسی مکتب کی پیروی کرے اور دیگر مسائل میں دوسرے کی اگر اس کا ضمیر ایسی اجازت دے تبدیلی مسلک کا یہ عمل تلفیق کہلاتا ہے۔ یہ حق بہر حال افراد کو حاصل ہوتا ہے مفتی اور قاضی کو نہیں جسے بہ لحاظ فرائض منصبی قوم کے کردار و عمل کے ذمہ دار نگراں کی حیثیت سے عوام کی صحیح رہنمائی کے لئے اپنے ہی مکتب کے نظریوں کی تقلید کرنی اور کرانی لازم ہوتی ہے اور جس کو صرف صدر حکومت ہی مفاد عامہ کے تقاضہ پر اس فرض سے بری الذمہ کر سکتا ہے۔

ان تمام مسائل پر شدت کے ساتھ بحث مباحثہ اور ردّ و قدح ہوتی رہی ہے۔ آج کل کے قانون ساز حق اجتہاد کے تو مدعی نہیں لیکن وہ یہ دعویٰ ضرور کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سابق مقننین اور شارعین کی آراء ہی سے منتخب اور اخذ کیا ہوا ہے اور یہ انتخاب اس اصول پر ہوا ہے کہ قانون کو بہر حال اقتضائے زمانہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ان کے وضع کئے ہوئے قانون جب 'اجماع' سے متصادم ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض وقت ہونا لازم ہے تو وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ واقعی طور پر ایسا ہوا ہے کیونکہ یہ خود ثبوت طلب ہے کہ ایسا 'اجماع'[1] کبھی معرض وجود میں آیا تھا۔ ورنہ کہیں نہ کہیں یہ بتا دیا گیا ہوتا کہ فلاں فلاں مسائل اجماع امت سے طے شدہ ہیں اور 'اجماع' اسی صورت میں مستند اور قابل پیروی ہوگا جب یہ ثابت ہو جائے کہ کسی مسئلہ پر صحابۂ رسول نے مدینہ سے منتشر ہونے کے پیشتر کامل طور پر اتفاق کر لیا تھا۔

آج کل کے مصلحین نے جن مسائل کو اٹھایا ہے وہ ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور نتائج میں دور رس۔ مثلاً اوامر و نواہی کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ ابھی یہ طے ہونا ہے کہ ان میں کونسے حکمی ہیں اور کون سے اختیاری، کیا ان کا یہ مطلب ہے کہ فلاں کام ہرگز نہ کرو یا یہ کہ نہ کرنے میں تمہاری بہتری ہے؟ کیا ان کا تعلق ضمیر انسانی سے ہے جس کی پرسش مرنے کے بعد آسمان پر ہوگی یا ایسے معاملات سے جن کی تحقیقات زندگی میں ارضی عدالتیں کریں گی؟ نیز یہ کہ آیا یہ احکام مقدس اب بھی قابل پابندی ہیں جبکہ وہ حالات اور شرائط مفقود ہو چکے جن کے تحت ان کا نفاذ عمل میں آیا تھا؟[2]

نظری طور پر تو مسلمانوں کے تمام افعال و اعمال پر شریعت حاوی ہے لیکن عملاً رواجی قانون بھی اپنی جگہ پر قائم رہا۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ خلفاء اور والیان ملک کے حکم سے احکام شرع نظر انداز کر دیئے گئے۔ تعزیری اور تجارتی معاملات میں خصوصاً ایسا ہوتا آیا ہے۔ قدیم سلطنت عثمانی میں تو مغربی سانچوں میں ڈھلے ہوئے تجارتی و تعزیری قوانین کوئی سو سال قبل ہی نافذ کئے گئے تھے۔ مصر میں بھی ۱۸۷۵ء میں نپولین کے کوڈ کی اساس پر

---

[1] جیسا کہ طلوع اسلام میں بتایا جا چکا ہے اجماع کا وقوع تو ایک طرف اس کی آج تک کوئی جامع تعریف ہی متعین نہیں ہو سکی۔ (طلوع اسلام)

[2] للہ الحمد کہ قارئین طلوع اسلام کے ذہن ان باتوں سے پریشان نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ یہ تمام امور طلوع اسلام کے صفحات پر اس طرح صاف اور واضح ہو چکے ہیں کہ ان کے متعلق اب شاید ہی کوئی ابہام باقی رہا ہو۔ (طلوع اسلام)

ایک ضابطہ دیوانی مدون ہوا اور اسی کے بعد سے مسلسل شرعی عدالتوں کا دائرہ عمل محدود ہوتا جا رہا ہے چنانچہ اب نکاح۔ طلاق۔ حضانت۔ حقوق اقربا اور وراثت جیسے شخصی معاملات ہی پر انھیں اختیار سماعت حاصل رہ گیا ہے اور ابھی چند ہی روز قبل ہبہ بالوصیت کے مقدمات بھی شرعی عدالتوں سے لیکر سول عدالتوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔

پسند اور انتخاب کی بنا پر شریعت کی نظر ثانی کوئی نئی چیز نہیں قابلِ احترام نظائر تاریخی اسکی حمایت میں موجود ہیں چنانچہ ایک سو سال کا عرصہ ہوا استنبول کے شیخ الاسلام نے فتویٰ دیدیا تھا کہ ایک ایسی عورت کا نکاح جسے شوہر نے چھوڑ رکھا ہو بذریعہ عدالت فسخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ فتویٰ مکتب حنفی کے جو سلطنت عثمانی کے سرکاری مذہب کی اساس تھے، سراسر خلاف تھا۔ اگرچہ بقیہ تین مذاہب فقہ اس کی اجازت دیتے تھے اسلئے حنفی حکام کو مجبور نہ کرنے کے خیال سے گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ معاملہ کسی دوسرے مکتب کے قاضی کے پاس غور اور تصفیہ کے لئے پیش کر دیا جائے۔ اسی طرح ۱۹۱۵ء میں ایک عورت کو فسخ نکاح کا اس بنا پر حق دیدیا گیا کہ اس کا شوہر بعض مخصوص امراض مبتلا تھا۔

اپیل کی عدالتیں ایک بہت بڑی تبدیلی جو مشرق قریب میں ہوئی ہے وہ عدالتہائے اپیل کا قیام ہے۔ شریعت کے انتظام میں تو کسی ایسی عدالت کی گنجائش نہ تھی اسلئے یہ ایک بدعت متصور ہوگی اور بدعات کو عام طور پر الحاد کا مترادف سمجھا جاتا ہے بایں ہمہ اس نئے انتظام کی چنداں مخالفت نہیں ہوئی کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ اس میں مفاد عامہ مضمر ہے۔

مصر میں ایک اور انوکھا طریقہ شرعی احکام کو نظر انداز کرنے کا اختیار کیا گیا ہے یعنی احکام شریعت تو جوں کے توں اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن ججوں کو بعض قسم کے مقدمات کی سماعت سے ممنوع کر دیا گیا ہے۔ نابالغوں کی شادی مصریوں کو سخت ناپسند ہے لیکن وہ اس پر قید و بند بمشکل عاید کر سکتے ہیں کیونکہ حضور اکرمؐ نے حضرت بی بی عائشہؓ سے ایسی عمر میں نکاح کیا تھا جبکہ وہ ابھی بچہ ہی تھیں اور گڑیاں کھیلا کرتی تھیں[1]۔ اسلئے اس پر اشاعت عائد کرنا دشوار تھا لہذا ۱۹۲۳ء میں انھوں نے یہ قانون پاس کیا کہ بجز اثبات نسب کے مقدمات کے عدالتیں کسی ایسے مقدمہ کی سماعت نہ کریں جن میں شادی کے وقت زوج کی عمر ۱۸ سال اور زوجہ کی عمر ۱۶ سال سے کم رہی ہو۔ عہدہ دارانِ سرکاری کو ممانعت کر دی گئی ہے کہ متذکرہ صدر سے کم عمر والوں کے نکاح کی رجسٹری نہ کریں۔ اسی طرح ناپسندیدہ، نامعقول، اور مضرت رساں احکام شرعی کو معطل اور بے کار کر دینے کی تدبیروں کو اور وسعت دی جا سکتی ہے[2]۔ مثلاً اگر کسی شخص نے مصلحت عامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شرعی اجازت و رعایت سے فائدہ اٹھایا ہے تو اسے عدالتی انصاف رسانی سے محروم کر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نابالغوں کے نکاح کی ہمت افزائی کرنے والے ایسا کرنے سے قبل دو بار سوچیں گے اور باوجود اسکے اگر انھوں نے شرعی رعایت سے فائدہ اٹھایا تو اس کی جوکھوں کے وہی ذمہ دار ہوں گے۔

ترکی کا قانون زمانہ حال کی سب سے اہم قانون سازی ترکی کے "قانونِ حقوق خاندانی" بابتہ ۱۹۱۷ء کی منظوری ہے۔ اس میں شبہ نہیں یہ قانون اب خود اس ملک میں موثر و نافذ نہیں جہاں یہ پاس ہوا تھا لیکن اس پر ایک بڑی حد تک شام، لبنان اور یردن

---

[1] یہ بالکل وضعی کہانی ہے۔ حضرت عائشہؓ نابالغ نہیں تھیں۔ ۔ قرآن کی رو سے نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے نابالغ کا نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ (طلوع اسلام)

[2] اس قسم کی حیلہ جویانہ تدبیریں اسلئے اختیار کرنی پڑتی ہیں کہ جرأت مندی سے اس کا اقرار نہیں کیا جاتا کہ دین اور رسول اللہؐ کی سیرت کی اصل قرآن اور صرف قرآن ہے اور جو کچھ قرآن کے خلاف ہے وہ غلط اور دقیانوسی ہے۔ جب تک یہ ذہنیت پیدا نہ ہوگی دین کا کوئی معاملہ صحیح خطوط پر تشکل نہیں ہو سکے گا۔ (طلوع اسلام)

میں عمل ہوتا ہے۔ اس کی رو سے ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی ممنوع ہے جو ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے اس کے ساتھ ایک توضیحی یادداشت بھی منسلک ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح نابالغاں کے بارے میں یہ نیا رجحان انسانیت کے اصول پر مبنی ہے[۱] یعنی کس قدر افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ ایسے بچے کو جسے بے فکری اور لاپرواہی سے گلی کوچوں میں کھیل کود میں مشغول رہنا چاہیئے بچے پیدا کرنے اور خانہ داری کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر مجبور کیا جائے ظاہر ہے کہ ایسی افسوسناک شادیوں سے مائیں اعصابی امراض کا شکار ہو جاتی ہیں اور اولاد کمزور نحیف و ناتوان۔ غرض اس قانون کے مجوزین اس رسم قبیح کو مسلمانوں کی موجودہ عام جسمانی ابتری کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے یہ حکم بھی دیدیا گیا ہے کہ عقد نکاح کے قبل عام اشتہار ضروری ہے اور رسیاہہ جات نکاح کی رجسٹری ایک مقررہ عہدہ دار کے روبرو لازم۔ بایں ہمہ خواہ زوجین عمر قانونی سے کم کے ہوں یا محرمات شرعی کے دائرہ میں آتے ہوں یا چار بیویوں[۲] کی موجودگی میں پانچویں بیوی کی جا رہی ہو، یا نکاح جبر کے تحت کیا جا رہا ہو نکاح فاسد نہیں قرار پاتا۔ نکاح صرف اسی صورت میں فاسد ہوتا ہے جب کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم مرد سے بیاہ کرے۔ دوسرے تمام نکاح بے قاعدہ اور ہوس رانی میں شمار ہوں گے لیکن ناجائز اور فاسد نہیں[۳]۔ اسی قانون کی رو سے مسلمان عورت کو یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنے نکاح کے معاہدہ میں یہ شرط کرے کہ شوہر اس کی زندگی میں عقد ثانی نہ کرے گا۔ یہ شرط جائز ہوتی ہے اور معاہدہ درست۔ مصر میں بھی ایسی اصلاحات کو جزو قانون بنانے کی بارہا کوششیں ہوئی ہیں لیکن کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک بار تو یہ ملک کا قانون بن ہی گیا ہوتا اگر مخصوص اختیارات شاہی کا استعمال کر کے اسے مسترد نہ کر دیا جاتا۔

قانوناً شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کا مہر ادا کرے اور اس کے نان و نفقہ کا بندوبست کرے۔ نکاح سے میاں بیوی میں باہمی وراثت کا تعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ بیوی پر لازم ہوتا ہے کہ میاں کے حق زناشوی کو پورا کرے بجز اس کے کہ وہ معذور ہو مثلاً بیماری۔ قید وغیرہ۔ کسی فریق کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے کسی رشتہ دار کو فریق ثانی کی صریح رضامندی کے بغیر ساتھ رکھے۔ اگر کوئی مرد اپنی زوجہ کے نان و نفقہ کا بندوبست کرنے میں غفلت و کوتاہی کرے تو بیوی عدالت سے استمداد کر سکتی ہے۔

میاں بیوی کے مابین طلاق واقع ہو جانے کی صورت میں ترکی کے اس قانون حقوق خاندانی نے حضانت کی اغراض کیلئے لڑکوں اور لڑکیوں کی عمر علی الترتیب سات اور نو سال سے بڑھا کر نو اور گیارہ سال کر دی ہے۔ سوڈان میں البتہ لڑکیاں شادی ہونے تک اپنی ماؤں کے ساتھ رکھی جاتی ہیں۔ یہ تمام اصلاحات زیادہ تر چاروں مذاہب فقہ میں سے کسی زیادہ انسانیت پسند اور منصفانہ رائے پر مبنی کی گئی ہیں[۴]۔

طلاق

اسی طرح مسلم ممالک میں عورتوں پر طلاق کے بارے میں جو ظلم اور ناانصافی ہو رہی تھی وہ ۔۔۔ حال میں بہت کچھ کم ہو گئی ہے حنفی فقہ کے تحت جو دنیائے اسلام کے بڑے حصہ میں نافذ ہے شوہر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ زوجہ کو کسی سبب پر یا بغیر کسی سبب کے بھی طلاق دیدے۔ اس کے بعد پھر ان دونوں میں مکرر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اگر شوہر اپنی حرکت پر منفعل ہو اور دوبارہ اسی عورت کو اپنی زوجیت میں

---

[۱] قرآن کے اصول پر جو نکاح کی عمر ہی بلوغت قرار دیتا ہے۔ (طلوع اسلام)

[۲] چار بیویوں کی کھلی چھٹی بھی قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ (" ")

[۳] کیسا مضحکہ انگیز قانون ہے یعنی نکاح تو ناجائز نہیں لیکن اس کے عملی نتائج ناجائز ہیں۔ (")

[۴] فقہ کی کوئی دائمی حیثیت نہیں۔ ہر دور کے مسلمان اپنے لئے قرآن کی روشنی میں آپ فقہ مرتب کر سکتے ہیں۔ (")

لینا چاہے تو بہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عورت نے طلاق کے بعد کسی اور سے شادی اور ہمبستری کے بعد اس سے طلاق حاصل کر لی ہو۔ شوہر بیوی کو تین بار طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر علیحدہ کر سکتا ہے لیکن زوجہ کسی وجہ پر بھی اپنے شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی[1]۔ بجز اس کے کہ معاہدۂ نکاح کے وقت اسے ایسا حق تفویض کیا گیا ہو۔ بدسلوکی۔ بے رحمانہ برتاؤ اور غفلت پرورش کی بنا پر بھی وہ تفریق عدالتی کی ڈگری حاصل نہیں کر سکتی۔ بیچاری زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہے کہ اگر شوہر نے اسے چھوڑ رکھا ہو اور اس سے بدسلوکی اور بیرحمانہ برتاؤ کرتا ہو تو درخواست دیکر عدالت کو متوجہ کرائے بشرطیکہ اس کے کوئی گواہ بھی ہوں۔ شوہر اگر امراض متعدی یا امراض خبیثہ میں مبتلا ہو تب بھی اسے خلع کی ڈگری نہیں مل سکتی۔ نکاح بزمانۂ نابالغی اور خیارِ بلوغ کے قطع نظر بیوی کے لئے واحد بنائے خلع شوہر کا عنین ہونا ہے۔ برعکس اس کے مرد کے لئے طلاق کی یہ سہولت اور یہ کثرت! یہ حدیث تو بڑے فخر کے ساتھ نقل کی جاتی ہے کہ جائز باتوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے مگر اس کے باوجود پیروانِ حدیث کا یہ عمل ایک مغربی قاری کی سمجھ میں نہیں آتا۔[2]

ہمیں تو مذہب حنفی کی یہ خصوصیت کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ دل لگی دل لگی میں بغیر نیت وارادہ کے جو طلاق دیدی گئی ہو وہ بھی اسی طرح حتمی اور موثر ہے جیسے عمداً دی ہوئی طلاق۔ جبراً یا ناجائز دباؤ سے دی ہوئی طلاق کا بھی یہی حال ہے۔ یہ عجیب بات یہیں ختم نہیں ہوتی، بحالتِ نشہ دی ہوئی طلاق بھی بشرطیکہ کسی اور نے مرد کو نشہ کی چیز نہ پلائی ہو یکساں موثر ہوتی ہے۔ ان سب احکام کی تہہ میں یہ منطق کارفرما ہے کہ طلاق ایک نہایت اہم چیز ہے اور ہر شخص کو اپنے افعال کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہئے لیکن اس حجت میں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ دل لگی ہو یا نشہ جبر سے طلاق دی جائے یا مرضی سے نقصان بہرحال عورت ہی کا ہے۔ طلاق کی اس مطلق العنان آزادی میں صرف ایک ہی رکاوٹ معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے عورت کے ولی کا یہ حق کہ عقد نکاح کے وقت کثیر المقدار مہر مقرر کرائے خواہ معجل ہو یا غیر معجل یعنی ایسی حالت میں واجب الادا جبکہ طلاق دی جائے یا شوہر فوت ہو جائے۔ اس تدبیر سے متمول طبقہ میں تو طلاق کی آزادی میں کچھ رکاوٹ ہو گئی ہے لیکن فلاحین پر جنھیں دو وقت کی روٹی ہی مشکل سے میسر ہوتی ہے اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

آج کے روشن خیال مسلمان اس صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ ہندوستان میں ۱۹۳۹ء میں کچھ اصلاحی تدبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ مصر کی مقننہ نے اس سے بھی دس سال قبل یہ قرار دیدیا تھا کہ بحالتِ نشہ یا ناجائز دباؤ سے دی ہوئی طلاق موثر نہیں سمجھی جائیگی صورت ثانی الذکر کے متعلق بقیہ تین مذاہب کی بھی یہی رائے ہے لیکن صورت اول الذکر کی تائید کرنے والے اقلیت میں ہیں اور باقی یہ کہتے ہیں کہ ایک ایسے شخص کو جو جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے اپنے الفاظ کا ذمہ دار نہیں قرار دینا چاہئے۔ اگرچہ اسے شراب جیسی ممنوعہ و حرام شے پینے کی حالت میں سزا دی جا سکتی ہے اور دینی چاہئے۔ طلاق مشروط کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ اختیار کیا گیا ہے یعنی اگر کوئی شخص اپنی زوجہ سے کہدے کہ اگر تو ایسی ایسی حرکت کرے تو تجھ پر طلاق واقع ہو جائے گی اور وہ ایسی حرکت کر گذرے تب بھی طلاق منظور نہیں کی جاتی

---

[1] طلاق کے متعلق یہ سب قوانین قرآن کے خلاف ہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] یہ اسلئے کہ جہاں ایک حدیث اس قسم کی ہے وہاں بیس حدیثیں اس قسم کی بھی ہیں جن میں خاوند کو "خدا" کی حیثیت دی گئی ہے۔ اور تاریخ میں ایسے واقعات بھی درج ہیں کہ ہماری بزرگترین ہستیوں نے سو سو عورتوں کو طلاقیں دیں۔ اس قسم کی وضعی احادیث اور من گھڑت تاریخ کی سند کے بعد کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے۔ (طلوع اسلام)

بجز اس شاذ و غیر متوقعہ صورتِ حال کے کہ شوہر بہر حال رشتۂ ازدواج ختم کرنے پر تُلا ہوا ہو۔

یہ ابتک تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ جلسۂ واحد میں دی ہوئی تین طلاقیں بھی ہر آئینہ موثر ہوتی ہیں لیکن نیا قانون سابقہ عملدرآمد کی تائید میں ہے یعنی یہ کہ ایک جلسہ میں دی ہوئی تین طلاقیں صرف ایک طلاق کے مساوی ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں رجوع جائز ہے ان اصلاحات سے عورت کا وہ خوف و ہراس اور آئے دن طلاق کا جو کھٹکا لگا رہتا تھا بہت کچھ کم ہو گیا ہے یہ ایک بڑی چیز ہے کیونکہ مطلقہ عورت کی حیثیت اور زندگی جسے بڑھاپے یا ادھیڑ عمر میں پھر شوہر میسر نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ملکوں میں نہایت زبوں اور خوار ہوتی ہے عموماً وہ عسرت و افلاس ہی میں چھوڑ دی جاتی ہے۔ باپ اگر زندہ ہو تو خیر وہاں جا کر جوں توں عمر کاٹ لے لیکن باپ نہ ہو یا مرد رشتہ دار اگر ذی مقدرت نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ ذلت و رسوائی کے علاوہ کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ نئے قانون نے جو وقتِ واحد میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا ہے عدت یعنی حالتِ انتظار کو بھی لاحق کر دیا ہے جس کا دوران تین ماہ اور عورت کے حاملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل تک رہتا ہے۔ شوہر اس اثناء میں بیوی کی پرورش کا ذمہ دار ہے اور بیوی ابھی دوسرا عقد نہیں کر سکتی البتہ مرد طلاق سے رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق قطعی ہو جانے کے بعد اسی عورت سے مکرر عقد کے جواز یعنی حلالہ کے طریقہ کو آج کل کے مسلمان سخت مکروہ اور ناپسندیدہ تصور کرتے ہیں اور بعضوں نے تو اس کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے[1]۔ اب طلاق صرف صحیح وقت ہی پر دی جا سکتی ہے اور عدت بہر حال ملحوظ رکھنی ضروری ہے۔ اگر طلاق ہر مہینہ میں ایک ہی بار دی جائے یہانتک کہ تیسری طلاق واقع ہو کر[2] ناقابل رجعت ہو جائے تو کم از کم یہ تو یقینی ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی کی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کی توقع باقی نہ تھی۔ میرے خیال میں مصر کا قانون بہ نسبت دوسرے ممالک اسلامی کے زیادہ منصفانہ اور انسانیت پسندی کا حامل ہے۔

مصر میں اصلاحات

مصر والوں کو طلاق سے پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیوں کا پورا احساس ہے ۱۹۴۳ء و ۱۹۴۵ء میں جو مسودات قانون پیش ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا گیا ہے توقع ہے کہ مجوزہ اصلاح کے نتائج دور رس ہوں گے۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ مقامی قاضی کے استمزاج کے بغیر کسی طلاق کی رجسٹری ہی نہ کی جائے۔ اگر مرد نے قاضی کو مطمئن کئے بغیر طلاق دیدی ہو تو گو وہ ناجائز نہ ہوگی لیکن وہ خود مستوجب سزائے جرمانہ و قید ہو سکے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی حکم میں تو کوئی دست اندازی نہیں کی گئی لیکن اس کے اطلاق کو جبکہ وہ معاشرہ کیلئے ضرر رساں ہے قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے دوسری تجویز یہ ہے کہ طلاق کو منظور کرنے کے قبل فریقین کے امور نزاعی و اخلاقی کی تحقیق کر کے ممکنہ کوشش دونوں میں صلح کرا دینے کی کر لینی چاہئے لیکن یہ ابھی مسودے ہی ہیں اور مقننہ کی منظوری کے محتاج۔

صورتہائے ذیل میں عورتوں کو شوہروں سے خلع حاصل کرنے کا حق حاصل ہے[3]:- (۱) اگر وہ ان کی پرورش میں تساہل اور غفلت کریں

---

[1] یہ بھی قرآن کے خلاف رسم ہے بلکہ انسانیت کے ہر شائستہ تصور کے خلاف جسے ہمارے مولوی صاحبان بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] یہ "ہر مہینے ایک طلاق اور اس طرح تین طلاق کا قاعدہ بھی غیر قرآنی ہے۔ (")

[3] قرآن کی رو سے عورت کو خلع لینے کا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا۔ (")

(۲) شدید جسمانی نقص یا عارضہ میں مبتلا ہوں۔ (۳) بدسلوکی اور ناروا برتاؤ کے مرتکب ہوں یا (۴) بیوی کو معلق چھوڑ دیں۔ واضح رہے کہ متذکرہ صدر مذاہب ثلاثہ بھی بیوی کا حق خلع مانتے ہیں جبکہ شوہر بیوی کو نان و نفقہ دینے میں عاجز ہو۔ ۱۹۲۰ء کا مصری قانون ان مذاہب کے دلائل اور مستثنیات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر شوہر افلاس و عدم استطاعت کا عذر کرے تو اسے ایک ماہ کی مہلت دیدی جاتی ہے لیکن نان و نفقہ دینے میں قصور اور غفلت پر عورت کو خلع مل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شوہر سزا بھگت رہا ہو اور اس طرح نان و نفقہ کی سبیل کرنے سے عاجز ہو اور قید سے چھوٹنے پر غریب کو معلوم ہو کہ اس اثناء میں بیوی کو خلع مل چکی ہے!

نان و نفقہ کی مقدار بیوی کی حیثیت اور شوہر کی استطاعت پر منحصر ہوتی ہے اور جہاں تک کہ نقائصِ جسمانی اور عوارضِ ذاتی کا تعلق ہے ہم بتا چکے ہیں کہ فقہ حنفی کے نزدیک شوہر کا عنین ہونا ہی صرف ایک وجہ خلع کی ہے۔ بقیہ تینوں مذاہب امراضِ خبیثہ اور عوارضِ مکروہ کو بھی خلع کی اغراض کیلئے معقول وجوہ تصور کرتے ہیں۔ وہ دلیل یہ لاتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے خود ایک بیوی کو جذام کے شوہر سے علیحدہ کر دیا تھا بحث ان کی یہ ہے کہ ایسے امراض جن سے کراہت ہوتی ہے اور آنے والے بچوں کی صحت و سلامتی کے لئے بھی موجب خطرہ ہیں یقیناً ایک معقول وجہ خلع کی متصور ہونے چاہئیں لیکن اگر عورت کو پہلے سے معلوم ہو کہ شوہر ان امراض میں مبتلا ہے تو اس صورت میں اس کی خلاصی کی کوئی صورت نہ تھی لیکن اب نیا قانون ایسی صورتوں میں بھی تفریق کو جائز رکھتا ہے۔ نیز بدسلوکی بھی خلع کی ایک جائز وجہ قرار پا گئی ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن کی رو سے نافرمانی کی علت میں یا اصلاح کی خاطر شوہر بیوی کو سزا بھی دے سکتا ہے[۱]۔ لیکن اس بارے میں کہ سزا کن کن صورتوں میں دی جا سکتی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہو گی بہت کچھ اختلاف آرا ہے اور ہر فعل شوہر کا جو جائز سزا کی حد کے اندر ہو قانون کی نظر میں بھی بدسلوکی اور بہیمانہ برتاؤ میں داخل نہیں ہوتا۔ الغرض اب صورتِ حال یہ ہے کہ شوہر کی بدسلوکی اور ناروا برتاؤ ثابت ہو جانے پر اگر قاضی دونوں میں مصالحت نہ کرا سکے تو وہ عورت کو خلع دے سکتا ہے لیکن قاضی اگر اس کی درخواست منظور نہ کرے اور عورت دوبارہ اسکی استدعا کرے تو اسے دو ثالث مقرر کرنے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں بھی میاں بیوی میں صلح و صفائی کرا دینے میں ناکام رہیں تو عدالت ان کی سفارش پر بذریعہ خلع تفریق کرا دے گی۔ اگر صورت یہ ہو کہ میاں نے بیوی کو چھوڑ دیا ہو لیکن اس کے نان و نفقہ کی سبیل کر دی ہو تو نیا قانون خلع کی ڈگری دینے سے قبل ایک دو سال کا توقف مناسب تصور کرتا ہے۔[۲]

ان نئے قوانین کے طفیل عورتوں کی مصیبت میں کچھ کمی ہو گئی ہے اور کٹر قدامت پرستوں کو چھوڑ کر عام طور پر ان اصلاحات کا خیر مقدم ہوا ہے لیکن بہت سے مسلمان ان اصلاحات کو بالکل ناکافی سمجھتے ہیں اور دوسروں نے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ نکاح کے صحیح تصور اور غرض و غایت کے منافی ہیں اور فطرتی محبت اور باہمی رفاقت میں جو حقیقی منشائے نکاح ہیں یہ تبدیلیاں خلل انداز ہو رہی ہیں۔ وہ اس سے تو انکار نہیں کرتے کہ بے رحمی و بدسلوکی یا شادی کے وقت شوہر کا عارضہ متعدی یا امراض خبیثہ میں مبتلا ہونا یا بیوی کو نان و نفقہ دینے میں مجرمانہ غفلت ایسے قصور ہیں جن سے ازدواجی زندگی باحسن الوجوہ ناممکن ہو جاتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اگر بدنصیب شوہر ناگہاں اور بغیر کسی قصور کے

---

[۱] یہ حق شوہر کو نہیں صرف عدالت کو حاصل ہے جو مقررہ قوانین کے خلاف ورزی کیلئے مرد کو بھی سزا دے سکتی ہے۔ (طلوع اسلام)۔

[۲] اسلئے کہ ان اصلاحات میں بالعموم قدم قرآن کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ کامل اطمینان کی صورت اسوقت پیدا ہو گی جب ہمارے قوانین بالکلیہ قرآن کے مطابق ہو جائیں گے۔ (طلوع اسلام)

اپنا مال کھو بیٹھے اور بے مقدرت ہو جائے تو بیوی کا اسے چھوڑ جانا کہاں کا انصاف ہے؟ نیز اگر شوہر شادی کے بعد کسی مرض قبیح یا عارضہ خبیث میں مبتلا ہو جائے اور یہ اس کے دانستہ اعمال کا نتیجہ نہ ہو تو بیوی کو خلع کی ڈگری دیدینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ یہ اعتراض اخلاقاً معقول اور مسکت ہیں لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ میاں تو بہرحال بیوی کو طلاق دینے میں آزاد ہے بشرطیکہ وہ قانونی شرائط سے تجاوز نہ کرے۔

وصیت ہبہ بالوصیت کے معاملات میں مصر دوسرے تمام ممالک سے آگے ہے۔ وہاں اب یہ جائز ہے کہ ہر فرد اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ کسی کے حق میں چھوڑ جائے خواہ وہ وارث ہو یا غیر اور اس کے لئے دوسرے ورثا کی رضامندی ضروری بھی نہیں۔ (بلاشبہ یہ فطرت انسانی سے بعید ہے خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ ورثا سے یہ توقع کرنا کہ غیر کے حق میں انتقالِ ورثہ پر رضامند ہو جائیں بیجا ہی ہوگا۔ جیسا کہ ۱۹۴۵ء کے قانون سے قبل انھیں حق تھا وہ ہرگز رضامندی نہ دیں گے) یہ جواز قانونی ان فتاویٰ کے بھی جو اجماعِ امت اور حدیثِ نبویؐ پر مبنی تصور کئے جاتے تھے بالکل خلاف ہے لیکن قانون سازوں نے اپنی تجویز کے وجوہ بتادیئے ہیں اور وہ کافی معقول ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائیداد الگ الگ علیحدہ اور معین کر کے جس طرح مناسب سمجھے اپنے ورثا میں تقسیم کر دے تو نزاع اور مقدمہ بازی ہی ختم ہو جاتی ہے اور یہ ایک اچھی چیز ہے علاوہ ازیں وصیت کنندہ کو اب یہ اختیار اور آزادی ہے کہ اپنی جائیداد کو تقسیم کرتے وقت . . . .

. . . . . . ہر ہر وارث کی اپنی جائیداد اور دولت یا ناداری کا بھی خیال رکھے اور اپنی جائیداد اس طرح تقسیم کرے کہ سب ورثا کی حاجتوں اور ضرورتوں کی سبیل ہو، ورنہ اگر وصیت تمام ورثا کی رضامندی کی محتاج ہی رہتی تو یقیناً ایسے ورثا جو سب سے زیادہ محتاجِ امداد تھے محروم رہ جاتے۔ وہ صاف صاف جرأت کے ساتھ بتادیتے ہیں کہ یہ قانون مصلحت و مفادِ عامہ پر مبنی ہے۔ اس بدعت کی تائید میں کوئی شرعی فتوے تو نہیں پیش کئے جاتے لیکن قرآن شریف کی اس آیت کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین۔ (۲/۱۸۰) کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جائیداد کے بارہ میں وصیت کرنی چاہیئے اپنے والدین اور اقربا کے مابین انصاف کے ساتھ۔ لیکن کثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس آیت کو دوسری آیات سے جو وراثت و وصیت کے بارے میں ہیں (۴/۱۲) منسوخ کر دیا گیا ہے۔ لیکن مصلحین اس حجت کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ان کی مستند آیت کی منسوخی کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے[1]۔ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ابن قتیبہ نے (المتوفی ۲۷۶ھ) اس مسئلہ سے کہ انتقالِ جائیداد بالوصیت قرآن کا حکم ہے یہ کہہ کر اعراض کر لیا تھا کہ وہ آیت منسوخ شدہ ہے اور یہ حدیثِ نبوی کہ ہبہ بالوصیت وارث کے حق میں نہیں ہو سکتا ثابت کرتی ہے کہ سنت بھی ناسخ قرآن ہو سکتی ہے۔ لیکن اس نکتہ کو ان کے مخالفین نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور اس کی تردید کرتے رہے[2]۔

---

[1] قرآن کریم ہر شخص کو اجازت دیتا ہے (بلکہ حکم دیتا ہے) کہ وہ اپنی جائیداد اور مال کے متعلق جو وصیت مناسب سمجھے کرے۔ اس میں نہ تو مال اور جائیداد کے کسی حصے کی تحدید ہے (کہ ⅓ حصہ تک وصیت کر سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں) اور نہ ہی یہ کہ وہ ورثا کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی وصیت اور قرضہ کے بعد کچھ بچ جائے تو اس کی تقسیم قرآن کے مقرر کردہ حصوں کے رو سے ہوگی۔ (طلوعِ اسلام)

[2] لیکن حدیث کو دین ماننے والے اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہے اور اس پر قاضی۔ (〃)

قرآنی قانون وراثت میں کوئی بندوبست یتیم پوتے پوتی کیلئے نہیں ہوا ہے[1] اس لئے نئے قانون میں حکم دیا گیا ہے کہ موصی نے خود اگر ایسے بچوں کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا ہے تو عدالت کو چاہئے کہ انھیں ترکہ سے اسی قدر حصہ دلوا دے جو بصورتِ حیات ان کے باپ کو ملتا مگر یہ کل متروکہ کے ایک ثلث سے زیادہ نہ ہونا چاہئے لیکن اگر انھوں نے دادا کی حیات میں کوئی مال ہبۃً پالیا ہو تو ان کا حصہ معین کرتے وقت اس کا بھی لحاظ ہونا چاہئے۔ اب تک چونکہ قرآن میں یتیم پوتے پوتیوں کے حقِ وراثت کے بارے میں کوئی ہدایت نہ تھی[1] ان کے حرمان اور مصیبت کا کوئی لحاظ نہ ہو سکا لیکن مصری قانون نے اسے وصیت کے ذیل میں لاکر اس دشواری کا اچھا حل نکال لیا ہے جسے وہ مستحسن اور جائز بھی تصور کرتے ہیں اور یہ سب اسی لئے ممکن ہو سکا کہ انھوں نے یہ ماننے سے بالکلیہ انکار کر دیا کہ وصیت کی آیت وراثت کی آیتوں سے منسوخ ہو چکی ہے۔

اوقاف

ناقابلِ انتقال اوقاف کا مسئلہ ہمیشہ نازک اور پیچیدہ رہا ہے۔ یورپ نے اس سے بہت کچھ مضرت اٹھائی ہے لیکن مسلمانوں میں وقف ایک اہم مسئلہ شرعی ہے[2] اس کی اصلاح و انتظام میں مفاداتِ حاصلہ کی سخت مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ مختصر طور پر وہ بندوبست جائیداد جسے وقف کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جائیداد بطور خیرات جاریہ کسی مذہبی ادارہ کو روانا دے سکتا ہے۔ یہ مذہبی اغراض یا مفادِ عامہ مثلاً مسجد، مدرسہ، شفاخانہ وغیرہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور دائمًا وقف علی الاولاد بھی لیے ہبہ بالوصیت میں رجوع کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ وقف کا انتظام ایک مہتمم کے تفویض ہوتا ہے جسے تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔ صدیوں کے دوران میں یہ اوقاف اتنے عظیم ہو گئے کہ ان کے انتظام کے لئے ایک علیحدہ وزارت قائم کر دینا پڑی۔ باوجود اس کے نظم و نسقِ اوقاف میں قسم قسم کی ابتریاں اور خرابیاں نمودار ہوتی رہیں[3] اور نہایت کثیر المالیت جائداد کی آمدنی اور قیمت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ بدنظمی اور بددیانتی کے باعث واقفین کا حقیقی منشا اور مقصود فوت ہو جانے کے علاوہ ملک کو بڑے بڑے رقبہ جاتِ اراضی کے بیجا استعمال سے بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ فی الحقیقت یہ ایک بڑی خرابی تھی کیونکہ سلطنت عثمانی کی تمام قابل کاشت اراضی کا تین چوتھائی حصہ اوقاف کے زیر نگرانی آ گیا تھا۔

یورپ کی حکومتوں نے تو بہت پہلے اس کا حل نکال لیا تھا[4] چنانچہ الجیریا میں سارے اوقاف فرانسیسی قوانین کے تحت لائے گئے تاکہ اراضیات کی کاشت کا انتظام اچھا ہو اور زیادہ سے زیادہ تمتع کیا جا سکے۔ مراکش میں بھی وقف کی اراضیات کے قابضین کو بعض شرائط کے تحت مالکانہ حقوق دیدیئے گئے ہیں۔ ترکی میں وزارتِ اوقاف ۱۹۲۴ء میں تخفیف کر دی گئی اور حکم دیدیا گیا کہ تمام جائیداد اوقاف فروخت اور ساری رعایا کا مفاد ملحوظ رکھکر ان کی کاشت کا بندوبست کیا جائے۔ مصر میں اوقاف کی اصلاح محمد علی اعظم نے شروع کی۔ اس نے وقف کی تمام اراضیات کو ضبط کر لیا اور ان لوگوں کو جو ان سے مستفید ہوتے آئے تھے معاوضہ ادا کر دیا۔ یہاں ۱۹۲۴ء سے وزارت اوقاف

---

[1] یہ فاضل مصنف کی قرآن سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن کی رو سے یتیم پوتا وراثت کیلئے اپنے باپ کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] قرآن کی رو سے وقف کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بھی خلافِ قرآن رسم ہے۔ (")

[3] ہونی چاہئیں۔ جو قانون بھی قرآن کے خلاف ہوگا اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ (")

[4] ان کے پاس اگر قرآن نہیں تو وہ کم از کم عقل سے تو کام لیتے ہیں اور تجربہ کے بعد جن امور کو نقصان رساں پاتے ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن مسلمان کو ان کا مولوی نہ قرآن کے قریب آنے دیتا ہے نہ عقل کے پاس۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں مولوی باقی نہیں رہتا۔ (")

بھی پارلیمنٹ کے تحت آگئی ہے جس میں یقیناً مفادِ عامہ ہی مضمر ہے۔

بانیانِ اوقاف کی بلاشبہ مستحسن نیتوں کے علی الرغم مسلمانوں کو اس انتظام کی خرابیاں صدیوں سے دکھائی دے رہی ہیں حتیٰ کہ نااہلی اور بددیانت مہتممانِ اوقاف کے خلاف کوئی عہدہ دارِ سرکاری بھی مناسب کارروائی نہیں کر سکتا۔ پھر ملک کا نقصان علیحدہ ہے کیونکہ اراضیات کی کاشت کا انتظام معقول نہیں ہوتا اچھی اور بروقت نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے عمارتیں منہدم ہو جاتی ہیں، ملک اپنے تمام وسائل سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتا ہے اور درستی و اصلاح کا نہ کسی کو خیال آتا ہے اور نہ کوئی اس جانب قدم اٹھاتا ہے۔

۱۹۴۹ء میں حکومتِ شام نے آئندہ کیلئے اوقاتِ خاندانی کا طریقہ ہی مسدود کر دیا ہے اور جو اوقاف اس مد میں جاری تھے ان کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ مصر میں بھی اس طریقہ کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑ پھینکنے کا شدت سے مطالبہ ہوتا رہا لیکن علما کی مخالفت[1] اسقدر شدید ہوئی کہ مصلحین کو ہار مان کر ایک درمیانی راہ اختیار کرنی پڑی۔ ۱۹۴۶ء میں ایک عارضی قانون پاس کیا گیا جس سے بعض بدترین خرابیوں کا استیصال ہو گیا ہے اور مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بانیانِ وقف کے مقصود اور منشا کو پورا کرنے کے بھی وسائل اختیار کئے گئے ہیں۔ نئے قانون کے تحت وقف اسی وقت موثر و جائز ہو سکتا ہے جبکہ اس کا شرعی عدالت کے ذریعہ اعلان کرا دیا جائے۔ گو ایسے اوقاف کو اس قانون نے ہاتھ نہیں لگایا جو مساجد سے متعلق تھے۔ لیکن خاندانی اوقاف اب دائمی نہیں رہے ہیں صرف آنیوالی دو نسلوں تک ان کا استفادہ محدود رہے گا۔ یقیناً نئے قانون کا یہ ایک زبردست اصلاحی اقدام ہے۔ اس کی تفاصیل کا تذکرہ چنداں سودمند نہ ہوگا اور یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس میں ملک کے عظیم تر مفادِ عامہ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ عماراتِ وقف کی نگہداشت اور مرمت کب اور کیسے ہوگی۔ فاضل آمدنی کس طرح سرمایہ پر لگائی جائے گی اس سے مستفید ہونے والے کس حد تک متمتع ہوں گے۔ یہ اور ایسے ہی مسائل ہیں جن سے سو سال پہلے نمٹنے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اب ان سب باتوں کا بندوبست مصلحت و مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کر دیا گیا ہے۔

۱۹۴۹ء سے لبنان کا قانون بھی ان ہی خطوط پر عمل کر رہا ہے۔ سوڈان نے بھی اگرچہ عورتوں کو جائز حقوق دلوانے کی طرف ابھی تک کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے لیکن اوقاف کی حد تک مصری قانون کو اپنا نمونہ بنا لیا ہے۔ حقوقِ خاندانی کے بارے میں مملکت اردن میں ایک نیا قانون بن گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عثمانی قانونِ حقوقِ خاندانی کے خطوط ہی پر اس کی تشکیل ہوئی ہے اور مصر کی ترقیات کو بھی خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً یہ طے کر دیا گیا ہے کہ شادی کے وقت لڑکے اور لڑکی کی عمر کم از کم علی الترتیب اٹھارہ اور سترہ سال کی ہونی چاہئے اگرچہ عدالت کی خاص اجازت سے ایک پندرہ سالہ لڑکی کا عقد بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اور تبدیلیاں بھی اصلاحی بیداری کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مثلاً طلاق اسوقت تک موثر اور قطعی نہیں سمجھی جا سکتی جب تک وہ تین علیحدہ علیحدہ مجالس میں مقررہ وقفوں سے نہ دی گئی ہو۔ اب قاضی کسی ایسی لڑکی کا نکاح نہیں پڑھ سکتا جو زوج سے عمر میں بیس سال سے زیادہ چھوٹی ہو بجز اس کے کہ اسے اس بات کا پورا اطمینان ہو جائے کہ لڑکی بطیب خاطر اس رشتہ کو قبول کر رہی ہے اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا ہے۔ ایک اور زیادہ ترقی پسندانہ اقدام یہ ہے کہ عورت کے اپنے معاہدۂ نکاح میں مخصوص شرائط درج کرانے کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسے بھی

---

[1] علماء کی طرف سے ہر اس اقدام کے مخالفت ہوگی جو قرآن یا عقل سے قریب ہو اور جس میں نوعِ انسانی کا مفاد ہو۔ (طلوع اسلام)

شوہر کو طلاق دینے کا (تفویض) اختیار ہوگا یا یہ کہ شوہر اسے دوسرے شہروں میں لیجا کر نہ رکھ سکے گا یا یہ کہ وہ اس کی زندگی میں عقد ثانی نہ کریگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی شرطیں اگر معاہدۂ نکاح کی رجسٹری کے وقت درج کرادی جائیں تو ان پر ضرور عمل ہوگا ورنہ بیوی درخواست دیکر نکاح فسخ کرا سکے گی۔ فی الجملہ اُردن کے اس قانون سے عورتوں کی پوزیشن بہت درست ہوگئی ہے۔ نان و نفقہ و اخراجاتِ زچگی کے ملنے اور بیرحمی و بدسلوکی پر تفریق کے حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ طلاق کے معاملہ میں یہ نیا قانون مصری قانون ہی کا اتباع کرتا ہے اور اگر کہیں کوئی فرق ہے بھی تو وہ عورت ہی کے فائدے کیلئے ہے جو طلاق کے معاملہ میں بہت گھاٹے میں رہتی ہے۔

عراق و ملّا

عراق میں البتہ اصلاحی عمل کی رفتار سست ہے۔ یہاں حکومتیں جلد جلد بدل جاتی ہیں اور شیعہ سنی کا خلفشار ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔ بریں ہم ۱۹۴۷ء میں عراق کی پارلیمنٹ کی عدالتی کمیٹی نے شخصی قانون کے ضابطہ کا ایک مسودہ منظور کرلیا ہے مگر پارلیمنٹ سے ابھی اسکی توثیق نہیں ہوسکی ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ عراق کی حالت مصر کی سی نہیں جہاں علم اور تعلیم کا کئی نسلوں سے چرچا ہے اور اعلیٰ تعلیم کافی پھیل چکی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ عراق میں قدامت پرست ملاؤں کی مخالفت بھی زیادہ شدید ہے۔ یہاں بھی اگر قانون کی متذکرہ خطوط پر تشکیل ہوجائے تو علما کے فتووں کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ آج تو یہ سارے پیچیدہ شرعی مسائل کی تعبیر کرنے کے تنہا ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ کل بے روزگار ہوکر گھر بیٹھ رہنے پر مجبور ہوں گے[1]۔ جعفری (شیعہ) فرقہ کے مجتہدین ایسی قانون سازی کو اپنی پوزیشن پر ایک کھلا ہوا حملہ تصور کریں گے۔ اسوقت تو پارلیمنٹ نے اس پر غور ملتوی کرکے مسودہ ایک کمیٹی کے سپرد کردیا ہے تاکہ ملکی حالات کے لحاظ سے مناسب ترمیمات تجویز کی جائیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اب زیادہ زمانہ نہ گذریگا اور یہ رپورٹ ایک نئے قانون کی اساس ہوجائے گی۔ اب تک ہم جن ضوابطِ قانون پر غور کرتے رہے ہیں ان سے یہ بالکل مختلف ہوگا کیونکہ اسے شیعہ اور سنی ہر دو فرقوں سے متعلق کرنا ہے۔ ان دونوں میں جہاں کہیں توافق ممکن نہ ہوسکا ضابطہ نے اجازت دیدی ہے کہ ہر دو اپنی اپنی روایات کے لحاظ سے عمل کرسکتے ہیں۔ جہانتک سنیوں کا تعلق ہے حقوق خاندانی کے متعلق قانونِ عثمانی اور نیز مصر میں جو حال میں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں یہ ضابطہ ان کی پیروی کرتا ہے۔ اس کی رو سے معاہداتِ نکاح اور شرائط طے شدہ کی رجسٹری لازمی قرار دی گئی ہے مگر یہ واضح نہیں ہے کہ آیا یہ شرائط وحدتِ نکاح اور انسدادِ بیرحمی و بدسلوکی پر بھی مشتمل ہوسکیں گی یا نہیں اس کی رو سے نابالغ لڑکیوں کا عقد بذریعہ ولی ممنوع نہیں ہے مگر رخصتی اس کے سنِ بلوغ تک ملتوی رکھنا لازم ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آسانی کے ساتھ یہ رکاوٹ دور اور شرط بیکار کردی جاسکتی ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضابطہ میں وہ معقول اور انسانیت پسند عنصر مفقود ہے جو ترکی اور مصر کے قانون میں موجود ہے۔ غیر مسلم میاں بیوی میں سے اگر ایک فریق اسلام قبول کرلے اور دوسرا ساتھ نہ دے تو نکاح خود بخود ساقط اور ازدواج کی تحلیل ہوجاتی ہے اسی طرح جب زوجین میں اختلاف پیدا ہوجائیں اور وہ امن چین سے زندگی بسر نہ کرسکیں تو اولاً ثالث ان کے مابین صلح و صفائی کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ ناکام ہوجاتے ہیں تو قاضی طلاق کی ڈگری دے سکتا ہے۔ الغرض اگرچہ شیعہ اپنے مخصوص قانون پر عمل پیرا ہیں فی الجملہ طلاق کے بارے میں مصری قانون کو نمونہ کی حیثیت سے اختیار کرلیا گیا ہے لیکن بیوی خُلع اسی صورت میں طلب کرسکتی ہے جب شوہر

---

[1] اسی کا نام "اسلام خطرے میں ہے" رکھا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)۔

عنین یا امراض خبیثہ میں مبتلا ہو یا بیوی کے نان ونفقہ کی سبیل کرنے میں قصور کرے۔

وراثت کے معاملہ میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ جس کے حق میں چاہے وصیتاً چھوڑ جائے مصر کی طرح شرعی احکام سے جیسی کہ اب تک ان کی تعبیر ہوتی رہی ہے یہ بھی ایک طرح کا اختلاف ہی ہے لیکن مصر سے یہاں کی صورت حال اس بارے میں کچھ مختلف ہے کیونکہ جعفری فقہ میں تو ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں رعایا کا بڑا حصہ دو فرقوں میں بٹا ہوا ہو یہ بہت آسان ہوتا ہے کہ ایک نصف آبادی کے مروجہ قانون کو دوسرے نصف سے بھی متعلق کر دیا جائے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ یہاں ایک معاملہ میں سنی مقید ہے اور شیعہ آزاد یعنی اپنی جائیداد کا چند شرائط کے ساتھ جس طرح اس کا دل چاہے بندوبست کر سکے تو یقیناً دوسرے فرقہ کے شہریوں کے دل میں یہ خیال گذرے گا کہ انھیں بھی کیوں ایسی ہی آزادی نہ ہو۔

ان تمام تفصیلات سے پتہ چل سکتا ہے کہ معاشرۂ اسلامی کی تنقید جو اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں شروع ہو گئی تھی بتدریج قوی ہوتی گئی ہے اور آہستہ آہستہ لیکن یقیناً مصلحین کے مساعی کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ قانون کا ارتقائی عمل تو آہستہ آہستہ ہی ہوتا ہے اس میں فوری اور تیز اصلاحی اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی بالخصوص جبکہ روایات کہنہ اور پیشوایان مذہب کی ساری قوتیں ایک ایسی اصلاح کے مقابلہ پر صف آرا ہو گئی ہوں جو روایاتِ قدیم یعنی نظریاتی بنائے شریعت حقہ کے منافی اور مغائر معلوم ہوتی ہے، بایں ہمہ بہت کچھ ہو چکا ہے اور کچھ ہونا باقی ہے وہ بھی ہو رہے گا۔[1] قانونِ اسلامی کو نہ صرف زمانۂ حال کے مقتضیات کے مطابق بلکہ نئے ضمیر کے موافق کرنے کے مقصد سے بھی مصر کی ایک ذمہ دار اور مقتدر جماعت نے دو اور اصلاحی تجویزیں پیش کی ہیں۔ یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ ۱۹۲۶ء میں وزارتِ مصر نے یہ مسودہ قانون پسند کر لیا ہے کہ کوئی شخص بلا منظوری قاضی دوسرا عقد نہ کر سکے اور قاضی کو یہ ممانعت ہو گی کہ تاوقتیکہ اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ شخص اپنے سارے متعلقین کی پرورش و نگہداشت باحسن الوجوہ کر سکے گا عقد ثانی کی منظوری نہ دے۔ یہ اطمینان مقدم اور ضروری ہے کہ وہ دونوں بیویوں کے مابین عدل و مساوات اور یکساں برتاؤ مرعی رکھے گا۔ اس مسودہ میں یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ کسی شخص کو بلا منظوری عدالت اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اختیار بھی نہ ہونا چاہیے اور عدالت کیلئے ضروری ہو گا کہ امور مابہ النزاع کی تحقیقات کرے اور تفریق کا حکم دینے کے قبل فریقین میں صلح و صفائی کرانے کی پوری کوشش کرے۔ اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرنے والا مستوجب سزائے قید و جرمانہ ہو گا۔ یہ ہر دو عمدہ مسودات قانون ابھی پارلیمنٹ کی توثیق اور منظوری کے محتاج ہیں۔

دنیائے اسلام میں ابھی اصلاحی تعلق سے تیز گامی کی توقع قبل از وقت ہی ہے کیونکہ مخالفانہ ردعمل کی طاقتیں ابھی کافی قوی ہیں اور سوائے ترکی کے بقیہ تمام اسلامی ممالک میں ان کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ سعودی عرب میں تو انھیں اقتدار کلی حاصل ہے بریں ہم علم اور تعلیم کی ترقی اور اخبار وغیرہ کے اچھے اثرات کے ساتھ ساتھ یہ اصلاحات جہاں جہاں اختیار کر لی گئی ہیں ان کے نتائج کڑے کر مسلمانوں کو بھی چونکا دینگے اور عجب نہیں کہ بالآخران بنیادوں کی جن پر ان کے قلعے قائم ہیں از سر نو جانچ پڑتال کرنے پر مائل کر دیں۔

---

[1] زمانے کے تقاضے خود مسلمانوں (بلکہ پوری نوع انسانی) کو کھینچ کھینچ کر قرآن کی طرف لا رہے ہیں اور وہ وقت قریب دکھائی دے رہا ہے جب انسان، انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر ایک خدا کے قانون کے سایے تلے آجائیگا۔ (طلوع اسلام)

ناسخ و منسوخ ہم نے اس کا ذکر کر دیا ہے کہ ملاؤں کی شدید مخالفت اور علما کے اس فتوے کے باوجود کہ ایک خاص آیت جس پر قانون سازوں کا استدلال تھا دوسری آیت سے منسوخ ہو چکی ہے مصر میں ایک اصلاحی قانون پاس کر لیا گیا لیکن یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ ایک ہزار سال سے یہ عقیدہ مضبوطی سے قائم ہے کہ قرآن کی بعض آیات دوسری آیاتِ مابعد سے منسوخ ہو چکی ہیں اور بڑی شدت سے انھیں اس پر اصرار ہے چنانچہ درمیانی زمانے کے مصنفین یہانتک کہ گئے ہیں کہ جن اصحاب کو ناسخ و منسوخ کا پورا وقوف نہ ہو انھیں تعبیر و تفسیر قرآن کے کوچہ میں قدم رکھنے کی بھی جرأت نہ کرنی چاہیئے۔ نہ صرف جدید مصر کے لوگوں نے بلکہ اوروں نے بھی اس کے خلاف ایک شدید ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا ہے چنانچہ پاکستان کے جریدہ "اسلامک لٹریچر" میں جس کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں جہاں ایک مضمون نگار نے ایک سلسلہ مقالات میں ساری تائیدی شہادت پیش کی ہے تو دوسرے نے اس کا معقول جواب بھی دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیاتِ قرآنی کی تنسیخ نہ کبھی فی الواقع ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے لیکن ہم خود جب اس مسئلہ پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ گو اس دعوے کی تائید میں جو حجتیں اور دلیلیں پیش کی جاتی ہیں سب صحیح اور معقول نہیں بریں ہم داخلی شہادت بھی اس کی حمایت میں ہے اور خارجی شہادت بھی اور یہ عقیدہ بالکلیہ بے بنیاد نہیں۔[۵۱]

اسبابِ زوالِ امت ایک عظیم الشان سنہری دور عروج سے جو یہ زوال آگیا ہے اس کا موجودہ مسلمانوں کو نہایت تلخ احساس ہے اور اکثر مصنفین نے اسباب زوال امت کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ مغربی تنقید کی بدولت[۵۲] اٹل تقدیر کا عقیدہ۔ عورتوں کی کمتری کا تصور۔ اندھا دھند روایات کی تقلید۔ دیانتدارانہ اختلاف رائے کی ناروا داری اور عام اخلاقی پستی و ناامیدی کی پرانی تعلیم سے ہر طرف بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے اور ایسی علامات کم نہیں ہیں کہ نئی نسل حتی الامکان اس زبوں حالی کا خاتمہ کرنے پر تل گئی ہے۔ عورتوں کو قید و بند سے، جس کے باعث وہ ہمیشہ کے لئے جہل اور مایوسی میں مبتلا ہو گئی ہیں رہائی دلوا کر انھیں موقع دینا چاہیئے کہ اس سے[۵۳] باہر نکلیں اور معاشرہ میں اپنا صحیح مقام حاصل کریں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ کارِ اصلاح میں تعاونِ عمل کی ہمت افزائی کی جائے اور غریب کسان کی گردن پر متمول زمیندار کا جوا باقی نہ رہنے دیا جائے ورنہ اسلام ملاؤں اور کمیونسٹوں کے دو چکی کے پاٹوں کے

---

[۵۱] قرآن کی رو سے ناسخ و منسوخ کا عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں چونکہ طلوع اسلام میں یہ مسئلہ نہایت وضاحت سے صاف ہو چکا ہے اس لئے ہمیں اس مقام پر اس بحث کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں اس وجہ سے ہم اپنے مضمون سے بھی اس بحث کو حذف کرتے ہیں۔ اگر ہماری طرف سے جواب انگریزی میں لکھا جا سکتا اور اس طرح وہ فاضل مصنف کی نظروں سے گزر سکتا تو ہم اس پر اس مسئلہ کی وضاحت کرتے اور اس کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے جن کی بنیاد پر اس نے سمجھ لیا ہے کہ قرآن کی رو سے یہ عقیدہ بے بنیاد نہیں۔ اس کے دلائل کم و بیش وہی ہیں جو ہمارے ہاں اس عقیدہ کے موید صدیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں جن میں روایت پرستی اور اشخاص پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ (طلوع اسلام)

[۵۲] اور قرآن کے براہِ راست مطالعہ کرنے کی بدولت۔ (〃)

[۵۳] یہ دعوت تو سب سے پہلے خود قرآن کی طرف سے دی گئی تھی۔ (〃)

[۵۴] قرآن کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔ (〃)

بیچ پس پسا کر رہ جائے گا۔ کیونکہ ملّا بھی سرمایہ داروں کے حامی اور پشت پناہ ہیں۔[۵۱]

بعض مصنفین تو اس قدر کھرا کھرا اور صاف کہدیتے ہیں اور موجودہ معاشرہ پر ان کی طعن و تشنیع اس قدر شدید ہے کہ ایک دو پشت پہلے کے مسیحی مشنری بھی اتنی جرأت اور بیباکی نہیں دکھا سکتے تھے۔ فرق اسی قدر ہے کہ وہ اس مشورہ کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے ہیں کہ خود مذہب اسلام ہی بڑی حد تک ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے[۵۲] اور صرف مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کے صحیح اصولوں پر نہیں چلتے۔

ان مصنفین کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ غلط اطلاعات کی بنا پر بعض مغربی مدبرین کا یہ خوف کہ مسلمان تو ہیں کمیونسٹ ہو جائیں گی بالکل بے اصل ہے[۵۳]۔ ترکستان کی بلشویک حکومت کو یہ لوگ سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جہاں کے حکمرانوں نے اسلام پر ایک باضابطہ حملہ بول دیا ہے۔ مقامی لیڈر قتل کئے جا رہے ہیں مسجدیں منہدم ہو رہی ہیں اور قرآن کو آگ میں جلایا جاتا ہے اور یہ سب کام ایسے مسلمان نوجوانوں ہی سے لیا جاتا ہے جنھیں الحاد اور بیدینی کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہاں سوویٹ کی گورنمنٹ نے جس شخص کو مسلمانوں کا پیشوا مقرر کیا ہے اور جس کا نام بھی چھپا نہیں رہا پولس کا ایک زوردار جاسوس بیان کیا جاتا ہے۔ اس ارے میں ایک مصنف کا رجحان اس جملہ سے ظاہر ہے کہ روسی حکومت کے جوئے سے ترکستان کی خلاصی بلاشبہ اسلام کے احیا اور تقویت میں معاون ہوگی۔

حرفِ آخر ملاؤں اور مفاد پرستوں اور مصلحوں کے مابین جو یہ جنگ جاری ہے اس کا انجام کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا بہت قبل از وقت ہے لیکن اگر ریڈیو اور پریس کے ذریعہ سے اصلاح کے پیغام کو سننے والوں کا دائرہ وسیع اور وسیع تر ہوتا گیا[۵۴] تو آئندہ چند برسوں میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ آہستہ آہستہ اسلام کی نئی تعبیر ان میں سرایت کرتی جائیگی اور مسلم معاشرہ دور رس اصلاحات سے ہمکنار ہو جائیگا کیونکہ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسمیں زمانہ کا ساتھ دینے کی ایک بے مثل صلاحیت ہے نیز باہم متضاد اور ناقابل توافق فلسفیانہ تخیلات اور ایک دوسرے سے مخالف مذہبی تصورات کو جذب کر لینے کا غیر معمولی ملکہ[۵۵] جن باتوں کو اس نے تجربہ سے مضرت بخش اور بے سود سمجھا ترک بھی کر دیا ہے۔ البتہ ایک خطرہ ہمیشہ اس کے سامنے رہے گا یعنی اس کی نئی آزاد اسپرٹ کے مقابلہ میں پرانی ردعمل کی قوتیں بھی جو جاہل عوام کو بآسانی برانگیختہ اور اہل بصیرت کو لرزہ براندام کر دینے والے ہتھیاروں یعنی لعنت اور تکفیر کے ہتھیاروں سے لیس ہیں اپنا پورا زور دکھائیں گی۔ بہرحال یہ مرورِ ایام ہی سے معلوم ہوگا کہ فتح کا سہرا کس کے سر رہتا ہے[۵۶]۔

---

۵۱ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر مسلمانوں پر ملا کی گرفت اسی طرح رہی تو ہماری ابھرنے والی نسل ملا کے اسلام سے تنگ آکر کمیونزم کی لادینی کے آغوش میں چلی جائے گی۔ اس کا صحیح علاج قرآن کا نظام ربوبیت ہے۔ (طلوع اسلام)

۵۲ ملا کا اسلام فی الواقعہ ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے لیکن قرآنی اسلام نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام نوع انسانی کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ (〃)

۵۳ قرآن کے سامنے آجانے کے بعد نہ تو مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ ہی مذہب کے سرمایہ داری اور لادینی نظام کا مؤید۔ (〃)

۵۴ جی نہیں! اگر قرآن کی صحیح تعلیم ان کے سامنے آگئی تو ان کی حیات تازہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ریڈیو اور پریس سے مغربی خیالات عام ہو رہے ہیں نہ کہ قرآن کی تعلیم۔ (〃)

۵۵ بات یوں نہیں۔ یوں ہے کہ قرآن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا اس طرح ساتھ دیتا جائے کہ اس کے غیر متبدل قوانین بھی اپنی جگہ سے نہ ہلیں اور انسانی آزادی پر بھی زد نہ پڑے۔ (〃)

۵۶ قرآن ہی کے سر رہے گا۔ ملا تو اب چند دن کا مہمان ہے۔ روشنی آجانے پر اندھیرے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ (〃)

طلوع اسلام

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن قوانین سے گلو خلاصی کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں اسقدر کشمکش اور اضطراب پایا جاتا ہے وہ تمام قوانین ایسے ہیں جن کی بنیاد فقہ یا روایات پر ہے۔ جیسا کہ طلوع اسلام نے بارہا بتایا ہے۔ یہ قوانین انہی زمانوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھکر وضع کئے گئے تھے جن میں یہ مدون ہوئے تھے۔ ان قوانین سے یہ مقصود ہی نہ تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے علیٰ حالہٖ رہیں۔ قوم کی بدبختی کہ اس کے مذہبی پیشواؤں نے (جن کا وجود ہی غیر قرآنی ہے) ان قوانین کو ابدیت کی سند عطا کردی اور یہ فیصلہ کردیا کہ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا خیال بھی الحاد و بے دینی ہے۔ لیکن یہ غیر فطری جکڑبندیاں بالآخر کب تک چل سکتی تھیں۔ جن قوموں نے کچھ سوچنا شروع کیا انھوں نے اس سے نکلنے کی راہیں تلاش کرنا شروع کیں۔ انہی کا نام وہ ترمیمات ہیں جن کا ذکر اس مقالہ میں آیا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے سامنے بھی خالص قرآن نہیں اسلئے وہ اپنی ترمیمات کے بارہ میں بڑی جھجک سی محسوس کررہے ہیں۔ اور ان کا انداز ایسا معروضی سا ہے گویا انھوں نے ان تبدیلیوں سے کوئی بڑا جرم کیا ہے۔ اگر ان کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ بڑی جرأت سے کہہ سکتے تھے کہ ہم قرآن کی روشنی میں اپنے لئے آپ قوانین مرتب کرنے کے مجاز ہیں۔ اس صورت میں وہ جو کچھ کرتے دل کے پورے یقین اور ذہن کی کامل جرأت کے ساتھ کرتے۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس سے ہم پاکستان کو بچانا چاہتے ہیں۔ مولوی کا تقاضا ہے کہ فقہ اور روایات کے جو قوانین چلے آرہے ہیں انھیں علیٰ حالہٖ نافذ کرنا ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ یہاں کے ارباب حل وعقد جب ان قوانین کو دیکھتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سے ہم عملی دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ ہے وہ الجھن جس میں اس وقت ملت اسلامیہ پھنسی ہوئی ہے۔ طلوع اسلام اسی الجھن کا قرآنی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اس کے خود مجاز ہیں کہ قرآن کریم کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق آپ قوانین وضع کریں۔ اگر ہم نے یہ روش اختیار کرلی تو ہمارا ہر قدم آگے بڑھے گا لیکن اگر ہم مُلّا کے شور اور ہنگامے سے دب گئے تو ہم اسی جال میں پھنس جائیں گے جس سے نکلنے کے لئے دیگر اسلامی ممالک کے لوگ اس بری طرح سے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

رفتارِ عالم

کیا اشتراکی اور غیر اشتراکی دنیائیں اس کرۂ ارض پر ایک ساتھ رہ سکتی ہیں؟ یہ سوال بین الاقوامی سیاست کا نقطۂ ماسکہ بنتا جارہا ہے۔ اشتراکیت یوں تو غیر اشتراکی نظام کی روادار نہیں ہوسکتی لیکن عملی سیاست میں اس نے مصلحت اس میں دیکھی ہے کہ غیر اشتراکی دنیا کو یہ یقین دلائے کہ اس کا مجرد وجود ہی اس کے لئے دعوتِ جنگ نہیں۔ یہ نظریہ پیش کرکے اشتراکی غیر اشتراکی اقوامِ مغرب کو یہ جھوٹی تسلی دینا چاہتے ہیں کہ وہ امن خواہ ہیں، نیز یہ کہ جنگ ایسی ناگزیر نہیں کہ اقوامِ مغرب اس کیلئے شبانہ روز تیاری کریں۔ زبانی جمع خرچ تو یہ ہے لیکن اشتراکیوں نے عملاً کوئی ایسا ثبوت نہیں دیا جس سے معلوم ہو کہ وہ جینے اور جینے دینے کے قائل ہیں۔ اس نکتہ کی تفسیریں ایشیا، یورپ اور اقوامِ متحدہ میں بڑی واضح طور پر ملتی ہیں۔

ایشیائی تصادم

دیکھا جائے تو سرخ چین نے ایسی طرح ڈال دی ہے کہ امریکہ ایشیا سے بالکل بے دخل ہوجائے۔ یہ تصادم پہلو بدل بدل کر ایشیا میں نمودار ہورہا ہے۔ امریکہ بے دخلی کے لئے تیار نہیں لیکن عملاً زیادہ مضبوطی سے قدم جما بھی نہیں سکا۔ کوریا میں امریکہ نے باقاعدہ جنگ لڑی لیکن بالآخر اسے فتح حاصل کئے بغیر معاہدہ التوائے جنگ پر راضی ہونا پڑا۔ ہند چینی میں فرانس نے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکہ کو اس پر صاد کرنا پڑا۔ اس سے چین کے حوصلے بڑھے اور اس نے ان جزائر پر حملے شروع کردیئے جو فارموسا تک پہنچنے میں زینے کا کام دیتے ہیں۔ صورتِ حال خراب ہوتی دیکھ کر امریکہ نے ہمت کی۔ چنانچہ امریکہ اور فارموسا کے مابین ایک دفاعی معاہدہ طے پایا جس کا مقصد امریکی سکریٹری آف اسٹیٹ ڈلیز کے الفاظ میں یہ ہے کہ امریکہ فارموسا کے اشتراکی قبضے میں چلے جانے پر رضامند نہیں ہوگا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ فارموسا پر اشتراکی حملہ ہوا تو امریکہ چین پر جوابی حملہ کریگا؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں اس کا یہ ایک ممکن نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے اگر فارموسا پر حملہ ہوا یا اس کی حکومت کو الٹایا گیا تو امریکہ کارروائی کرے گا۔ چینی وزیرِ اعظم چواین لائی نے اس معاہدہ کو سنگین جنگی اشتعال انگیزی قرار دیا ہے اور امریکہ کو خطرناک نتائج سے ڈرا کر یہ کہا گیا ہے کہ وہ فارموسا سے اپنی فوجیں واپس بلالے۔ روس نے اس مسئلہ کو فوراً اقوامِ متحدہ میں پیش کردیا لیکن وہ امریکہ کے خلاف قرارداد مذمت منظور کرانے میں ناکام رہا۔

اِدھر باہمی دفاع کے مذاکرات ہورہے تھے، اُدھر چین نے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا۔ کوریا کی لڑائی میں چین نے جو امریکی سپاہی جنگی قیدی بنائے تھے، ان میں سے بعض ابھی تک رہا نہیں کئے گئے حالانکہ معاہدہ یہ تھا کہ جو جنگی قیدی اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیں گے انھیں واپس جانے دیا جائیگا ان دنوں اس نے ان میں سے گیارہ ہوابازوں کو جاسوسی کے الزام میں سزا دیدی ہے۔ اشتراکیوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ ہوباز جنگی قیدی نہیں تھے بلکہ جاسوس تھے لہٰذا معاہدہ کی شرط کے مطابق انھیں رہا نہیں کیا جاسکتا۔ امریکہ اور ان اقوام کا جو امریکہ کے ساتھ کوریا میں مصروفِ جنگ رہیں تقاضا یہ ہے کہ یہ جنگی قیدی ہیں۔ جب چین نے اس کی پروانہ کی تو امریکہ نے معاملہ اقوامِ متحدہ میں پیش کردیا، جہاں روس کی مخالفت کے علی الرغم جنرل اسمبلی نے

اس مضمون کی قرارداد منظور کردی کہ جنرل اسمبلی چین کے اقدام کی مذمت کرتی ہے اور اسے کوریائی معاہدۂ امن کی خلاف ورزی قرار دیتی ہے قرارداد میں سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ قیدیوں کی رہائی کے لئے کوشش کریں اور ۳۱ دسمبر سے پیشتر تمام ارکان اسمبلی کو نتائج سے مطلع کریں۔ یہ قرارداد منظور ہوتے ہی سکریٹری جنرل مسٹر ڈاگ نے چینی وزیراعظم چواین لائی کو ایک تار بھیجا جس میں معاملہ مذکور سے متعلق ذاتی حیثیت سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ قرارداد سے متعلق چینی وزیراعظم نے ایک جلا کٹا بیان شائع کیا جس سے عام طور سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ مسٹر ڈاگ ملاقات کرنے میں ناکام رہیں گے اور اس سے اقوام متحدہ کے وقار کو صدمہ پہنچے گا لیکن شدید ناقدانہ بیان دینے کے بعد چواین لائی نے ملاقات پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ یہ ملاقات اس ماہ کے آخر میں یا جنوری میں ہوگی اور اس اعتبار سے بے مثال کہ اقوام متحدہ کا سکریٹری جنرل ایک ایسے اشتراکی ملک میں معاملہ طے کرنے جائے گا جسے اقوام متحدہ نے اپنا رکن تسلیم نہیں کیا۔ اشتراکی چین کا یہ رویہ متضاد ضرور نظر آتا ہے لیکن یہ اس کی حکمت عملی کا اہم جزء ہے۔ وہ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہا ہے کہ اقوام متحدہ کا رکن بن جائے لیکن کامیابی کی کوئی صورت ابھی تک نہیں نکل سکی۔ حال ہی میں امریکہ کی کوششوں سے جنرل اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ چینی رکنیت کے سوال کو مزید ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا جائے چین چاہتا ہے کہ وہ جائز و ناجائز ذرائع سے اس سوال کو تازہ رکھے تاکہ شاید کوئی بات بن جائے۔ ہوابازوں کے سلسلہ میں بھی اس کی کوشش یہ ہے کہ اسے سودا بازی کا ذریعہ بنایا جائے۔ ایسے مسائل سے وہ ایک اور بھی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ان کے بل پر دیگر اقوام بالخصوص ایشیائی اقوام کے دل میں یہ خیال جاگزیں کرانا چاہتا ہے کہ امریکہ نہ محض چین کے خلاف جنگی اقدامات کر رہا ہے بلکہ اس کی حدود میں جاسوسی کا جال بھی پھیلاتا جا رہا ہے اور اس طرح انھیں امریکہ کے خلاف بدظن کرنا چاہتا ہے۔ اس بدظنی کے لئے گنجائش بھی کافی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہوابازوں کے معاملہ میں ہی امریکہ میں رائے عامہ پر یہاں تک اثر ہوا کہ بعض حلقوں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر چین ہوابازوں کو رہا نہ کرے تو اس کی بحری ناکہ بندی کی جائے۔ یہ غنیمت ہے کہ صدر آئزن ہاور نے بڑے تحمل سے کام لیا اور اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔

ہوابازوں کا مسئلہ ہے بہت ٹیڑھا۔ چواین لائی نے ہر چند واگ کو چین بلا لیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان مذاکرات میں یہ مسئلہ طے ہو جائے چین اس پر سودا بازی ضرور کریگا اور امریکہ اس کے لئے تیار نہیں۔ ان حالات میں تصفیہ کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چین نے ہوابازوں کو رہا نہ کیا تو امریکہ کیا اقدام کریگا؟ اس کے متعلق اسوقت وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ بعض اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اس صورت میں اقوام متحدہ سے مطالبہ کریگا کہ قوت استعمال کر کے چین کو رہائی پر مجبور کرے۔ یہ صورت جنگ کے مترادف ہو جائیگی۔ کیا کوئی قوم جنگ کی طرح ڈالنے کے لئے تیار ہوگی؟

دفاعی تیاریاں

جنگ کی طرح پڑے یا نہ امریکہ اشتراکیت کے خلاف مدافعتی تیاریوں میں ضرور مصروف ہے۔ فارمیسا سے متعلق معاہدہ انہی تیاریوں کے سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے کیونکہ اس کی زد براہ راست چین پر پڑتی ہے۔ سیٹو کا معاہدہ بھی جس میں پاکستان شامل ہے اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ ان دنوں میں ویٹ نام کے متعلق بھی ایک قسم کا معاہدہ ہو گیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے ویٹ نام دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ شمالی حصہ اشتراکیوں کے قبضے میں ہے اور جنوبی فرانس کے زیر اثر۔ التوائے جنگ کے معاہدہ کی رو سے ہر دو حصوں میں جنگی تیاریوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہئے لیکن ان دنوں بعض انکشافات ایسے ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اشتراکیوں نے

اپنے ہاں کم و بیش تین ڈویژن فوج بڑھالی ہے۔ فرانس کے نزدیک یہ تیاریاں تشویشناک ہیں۔ اسے دیکھ کر وزیراعظم فرانس کی خواہش یہ ہے کہ جنوبی ویٹ نام میں دفاع کی کوئی ایسی صورت پیدا کرلی جائے جس میں امریکہ کی معاونت بھی ہو۔ یہ خواہش بجا لیکن وہ کھلم کھلا امریکہ سے استمداد نہیں کرسکتے کیونکہ یہ اشتراکیوں کے لئے پھر سے جنگ شروع کردینے کا بہانہ بن سکتا ہے۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں وزیراعظم فرانس نے امریکہ کے دورے کے دوران میں اس نوع پر تبادلہ خیالات کیا۔ اس کے بعد جو اعلامیہ شائع ہوا اس میں مذکور ہے کہ مسٹر مینڈس فرانس اور مسٹر ڈلیز اس پر متفق ہیں کہ باہمی تعاون سے ایسے طریق ہائے کار اختیار کریں جن سے ویٹ نام کو اپنی آزادی برقرار رکھنے میں مدد ملے۔ یہ دیکھنا ہے کہ ان کی عملی شکل کیا ہوگی لیکن اس سے امریکہ کے عزائم کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ روس کی پالیسی کے مطابق ضرور ہے گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں پالیسی سراسر روس کی ہے یا چین کی۔ ویسے قرائن سے پایا ضرور جاتا ہے کہ چین روس کا حلقہ بگوش نہیں بہت حد تک آزاد جا رہا ہے۔ فی الحال یہ آزادی بین الاقوامی سیاست میں روس کے حق میں جا رہی ہے روس کا اپنا میدان یورپ بن گیا ہے۔ معاہدات پیرس، جن کا تفصیلی ذکر دسمبر کے طلوع اسلام میں آچکا ہے، حکومتی تصدیقوں کے مراحل سے گذر رہے ہیں۔ روس کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہ تصدیق نہ ہو تاکہ ان پر عمل درآمد نہ ہوسکے۔ اس عمل کو روکنے کیلئے اس نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام متعلقہ اقوام کی ایک کانفرنس ماسکو میں ہو۔ اس کے لئے اس نے ۲۳ اقوام کو مدعو کیا۔ امریکہ اس میں شامل تھا۔ اس کے ساتھ یہ تجویز بھی تھی کہ چین کو بہ حیثیت مبصر بلایا جائے۔ اسی طرح مشرقی جرمنی کو تو مدعو کیا گیا لیکن مغربی جرمنی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اقوام مغرب پر اس دعوت کا چنداں اثر نہیں ہوا اور ان کا عمومی رویہ یہی رہا کہ ہاں ایسے مذاکرات ہونے چاہئیں لیکن معاہدات پیرس کی تصدیق کے بعد۔ اس سلسلہ میں روس نے جو یادداشت بھیجی اس کے جواب میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے لکھا کہ معاہدات پیرس کی تصدیق کو ہرگز روکا نہیں جاسکتا۔ البتہ اس کے بعد دول اربعہ عظمیٰ کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس طلب کی جاسکتی ہے بشرطیکہ روس آسٹریا کے معاہدۂ امن پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہو جائے اور وحدتِ جرمن کے متعلق اپنی حکمت عملی واضح کرے۔ روس نے اسے تسلیم نہیں کیا اور اس نے اقوام مغرب کو یہ چکمہ دیا کہ اگر معاہدات پیرس کی تصدیق ملتوی کر دیں تو مجوزہ کانفرنس کو بھی ملتوی کیا جاسکتا ہے۔ کسی ایک بات پر اتفاق نہ ہوسکنے کی صورت میں ماسکو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں روس کے سات اشتراکی یورپی ممالک تھے اور چین بحیثیت مبصر کے موجود تھا۔ کانفرنس میں جو تقریریں ہوئیں ان میں سارا زور اسی پر صرف کیا گیا کہ اگر اقوام مغرب جرمنی کو مسلح کرنے سے باز نہ آئیں تو شرکاء مجبور ہوں گے کہ اپنی مدافعت کے لئے مشترکہ اقدامات کریں۔ چار دن کی "نشستند و گفتند" کے بعد کانفرنس نے اعلان کیا کہ ممکنہ حملہ کے خلاف پورے دفاعی انتظامات کئے جائیں گے، نیز متعلقہ ممالک کی افواج اور کمانوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ گویا مغربی ناٹو کے مقابلہ میں ایک طرح کا اشتراکی ناٹو تشکیل کیا جائیگا۔ اس اعلان کا بھی مغرب پر چنداں اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ مغرب کے خیال میں روس پہلے ہی اپنے ماتحت ممالک کی فوجوں کو اپنے اقتدار میں کر چکا ہے۔ اور وہ جنگی تیاریاں حتی الامکان کر رہا ہے، لہٰذا اس فیصلہ سے اس کی حکمت عملی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔

ایٹمی توانائی اقوام متحدہ میں ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال پر شرق و غرب میں کافی چپقلش رہی۔ کوئی ایک سال ہوا صدر آئزن ہاور نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایٹمی توانائی کا ایک ذخیرہ اقوام متحدہ کی تحویل میں کیا جائے اور اسے دنیا بھر میں ضروریات امن کے لئے

استعمال کیا جائے۔ اس تجویز پر روس اور امریکہ میں براہ راست مذاکرات بھی ہوتے رہے لیکن کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اقوام متحدہ میں روس کی کوشش یہ رہی کہ مجوزہ ذخیرے کا انتظام حفاظتی کونسل کے سپرد ہو تاکہ اسے حق استرداد (VETO) استعمال کرنے کا موقع ملتا رہے۔ اس کے برعکس امریکہ اسے جنرل اسمبلی کے سپرد کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے روسی استرداد کی زحمت سے بچایا جا سکے۔ کوئی تصفیہ نہ ہو سکنے کی صورت میں امریکہ نے سات اور اقوام کی مدد کے ساتھ ایک نیا منصوبہ تیار کیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ روس شامل ہو یا نہ اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اس نئی تجویز پر بحث ہو رہی تھی کہ امریکی نمائندے نے یہ ڈرامائی اعلان کر دیا کہ امریکہ نے دو سو بیس پونڈ ایٹمی مواد دوسرے ممالک میں تجرباتی استعمال کے لئے اقوام متحدہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوسرے دن برطانوی نمائندے نے اعلان کیا کہ اس کی حکومت نے چالیس پونڈ ایٹمی مواد اسی طرح اقوام متحدہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ دو اعلانات روسی توقعات کے یکسر خلاف تھے اور بڑے فیصلہ کن ثابت ہوئے چنانچہ یہ قرارداد منظور ہو گئی (روس نے بھی اس سے اتفاق کیا) کہ اگلے سال تمام حکومتوں کی ایک کانفرنس طلب کی جائے جو ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کے ذرائع سوچے نیز جو ایٹمی مادہ امریکہ اور برطانیہ نے اقوام متحدہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اسے بھی استعمال کرنے کا طریق کار فیصل کرے۔ اس فیصلہ پر پوری طرح عمل درآمد کیا جائے تو اس سے بڑے دوررس نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سے نہ محض ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال شروع ہو جائیگا بلکہ وہ ممالک بھی ایٹمی تجربے کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو اس وقت مواد، ماہرین اور سرمائے کی کمی کی بدولت ایسا کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتے۔

ممالک اسلامیہ کی کشمکش

دنیائے اسلام ایک کشمکش سے دوچار ہے۔ ایک طرف وہ طرح طرح کے داخلی خلفشار میں مبتلا ہے اور دوسری طرف عالمگیر قوتیں ان پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مسلمان حکومتیں اندرونی طور پر مستحکم ہو جائیں تو وہ بیرونی قوی سے عہدہ برآ ہو سکیں گی لیکن فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا گو بعض علامات ایسی نمودار ہو رہی ہیں جن سے بہتری کی امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ ٹیونس میں حکومت اور فرانس کے مابین جو تصفیہ ہوا تھا اس کے مطابق شورش و بدامنی بہت حد تک ختم ہو گئی ہے۔ اس سے خود مختاری کے حصول کے لئے فضا زیادہ سازگار ہو جاتی ہے لیکن یہ دیکھنا ہے کہ خود مختاری کے لئے جو مذاکرات ٹیونس اور فرانس کے مابین ہو رہے ہیں، ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اگر فرانس نے دیانتداری سے اس ملک کو خود مختاری دینے کی کوشش کی تو اس تنازع کا تصفیہ یقیناً ہو جائیگا لیکن اگر اس نے ذرا بھی بخل سے کام لیا تو اس علاقے میں امن کی توقع عبث ہو گی۔ ٹیونس کے ساتھ مراکو اور الجیریا میں بھی شورش برپا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دہشت پسندی سے قوموں کی قسمتیں طے نہیں کی جا سکتیں لیکن اگر فرانس مصالحت پر آمادہ نہ ہو تو آزادی خواہوں کے پاس "بغاوت" کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔ مراکو اور الجیریا پر ٹیونس کے تصفیہ کا لامحالہ اثر پڑیگا۔ اگر ٹیونس کو خود مختاری مل گئی تو مراکو اور الجیریا کے لئے ایک راہ واضح ہو جائیگی۔ ٹیونس سے ادھر مصر میں حالات پھر ناگوار صورت اختیار کر گئے ہیں۔ درحقیقت شاہ فاروق کی برطرفی کے بعد جو جنگ اقتدار مصر میں شروع ہوئی اس کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ رفتہ رفتہ لیکن بودے انداز سے کرنل ناصر حقیقی اقتدار کے مالک بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جنرل نجیب سے وہ گلو خلاصی کرا چکے ہیں اور اخوان المسلمون کو نہ محض توڑ چکے ہیں بلکہ اس کے کئی ممتاز ارکان کو تختہ دار پر لٹکا چکے ہیں۔ اخوان کے قائد الہضیبی کو پہلے سزائے موت دی گئی تھی مگر بعد میں اسے عمر قید میں تبدیل

کر دیا گیا۔ اخوان مصر کا از حد نازک معاملہ ہے۔ یہ جماعت بڑی منظم اور ہمہ گیر تھی اور اب تک وہ بظاہر فوجی حکومت کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ اب اس تصادم کے بعد حکومت مصر کی کیا پوزیشن ہو گی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا یقین ہے کہ حکومت کو بحالات موجودہ مستحکم نہیں کہا جا سکتا۔

اس عدم استحکام کا اثر دیگر ممالک عربیہ پر بھی پڑ رہا ہے۔ مصر اندرونی خلفشار سے پاک ہوتا تو اس کا بین الاقوامی سیاست میں بڑا عمدہ کردار ہوتا۔ وہ سوڈان کا مسئلہ بھی حل کر چکا ہے اور سویز کا بھی۔ ان تنازعات کے تصفیہ کے بعد وہ قومی ارتفاع پر بھی کافی توجہ صرف کر سکتا تھا لیکن اب اس کی تمام تر توجہ اندرونی کشمکش کی نذر ہو رہی ہے۔ اس سے نہ وہ صاف طور پر مغرب سے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کر سکا ہے نہ دیگر ممالک عربیہ ہی متحدہ طور پر ایسا کر سکی ہیں۔ اس سے عربی وحدت کو کافی ضعف پہنچا ہے اور بہت حد تک مصر اس کا ذمہ دار ہے۔ مصر ہی کی بدولت مشرق وسطیٰ میں کوئی دفاعی تنظیم قائم نہیں ہو سکی۔ حالانکہ ممالک عربیہ اس کے متمنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عراق نے از خود براہ راست امریکہ سے فوجی امداد طلب کی عراق اور اردن دونوں برطانیہ سے معاہدات کی ترمیم و اصلاح میں مصروف ہیں۔ اگر ممالک عربیہ متحدہ اقدام کر سکنے کے قابل ہوتے تو یہ ترمیمات مختلف انداز سے سرانجام دی جا سکتی تھیں۔

بین الاقوامی حالات جس انداز سے پلٹا کھاتے چلے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر امریکہ مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک امریکہ سے دوستی کا دم بھرتے ہیں لیکن کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ عرب لیگ کے سامنے عربی ممالک کی اجتماعی مدافعت کا سوال درپیش ہوا تو یہی طے پایا کہ اس کی مدافعت از خود کی جائے حالانکہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام عربی ممالک مل کر بھی کوئی قابل ذکر دفاعی سلسلہ قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ امریکہ سے سامانِ جنگ اور سرمائے کی مدد نہ لیں۔ ممالک اسلامیہ میں ترکی ایسا ملک ہے جو شاید اس عام عدم استحکام میں کچھ توازن پیدا کر سکے۔ ترکی اور مصر کے تعلقات کچھ عرصہ سے خراب چلے آ رہے ہیں لیکن اب ان میں خوشگواری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ ترکی وزیر اعظم عنقریب مصر جا رہے ہیں۔ اس سے کم درجے پر آمد و رفت ہو چکی ہے اس دورے کا نتیجہ کیا نکلے گا اس کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے۔

نئی راہِ عمل

۲۴ اکتوبر کو ہنگامی حالات کا اعلان کر کے اور مجلس دستور ساز کو ختم کر کے گورنر جنرل نے ملکی سیاست کو جس شاہراہ پر ڈال دیا تھا اس کا دوسرا سنگ میل ۲۲ نومبر کو سامنے آیا جبکہ وزیر اعظم نے ایک نشری تقریر میں یہ انقلاب انگیز اعلان کیا کہ حکومت نے مغربی پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر ایک صوبہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس تبدیلی کو بروئے کار لانے کیلئے ماہرین کی ایک کمیٹی کو تفاصیل طے کرنے پر مامور کر دیا گیا۔ اس فیصلہ کی مزید تفصیل وزیر اعظم نے یکم دسمبر کی ماہانہ نشری تقریر میں بہم پہنچائی۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ پنجاب نے وحدت مغرب کیلئے یہ قربانی کی ہے کہ ۵۶ فی صدی آبادی کے باوجود اس نے مغربی پاکستان کی مجوزہ اسمبلی میں صرف ۴۰ فی صدی نیابت قبول کر لی ہے تاکہ دوسرے صوبے یہ نہ سمجھیں کہ ایک یونٹ میں ان کے حقوق پامال ہوں گے یا ان کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ پنجاب کے اس ایثار کی وزیر اعظم نے بہت تعریف کی، اور بات ہے بھی تعریف کے قابل۔ ذرا اس کا مقابلہ کیجئے بنگال کی تمام نہاد اکثریت کے رویہ سے۔ برطرف شدہ مجلس دستور ساز میں مسلم لیگی بنگالی اکثریت نے عددی برتری کے زور پر ملکی مفاد کو کچل کے رکھ دیا۔ اس نے اپنی برتری جتانے کا کوئی موقع فراموش نہیں کیا عام اس سے کہ اس سے ملک و قوم کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچا ہو۔ اسی مذموم ذہنیت نے ملک کو اس قعر مذلت میں پہنچایا جس میں وہ ۲۴ اکتوبر کو پہنچ چکا تھا۔ وزیر اعظم نے اس کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ۱۴۔ ۱۵ دسمبر کو انھوں نے کراچی میں ایک کانفرنس طلب کی ہے جس میں صوبوں کے گورنر اور

وزرائے اعلیٰ وغیرہم شریک ہوں گے اور مناسب غور و خوض کے بعد اہم فیصلے کریں گے۔

ادھر ۲۲ نومبر کو وزیر اعظم نے ایک یونٹ بنا دینے کی تجویز کا اعلان کیا اور اُدھر ملک میں مرحبا کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے اور انفرادی تائید کے ساتھ اجتماعی تائید کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ خیر پور اسمبلی نے پہلے بھی اپنا فیصلہ وحدت کے حق میں دے رکھا تھا۔ اس کے بعد پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی جس میں تجویز وحدت کی پوری پوری حمایت کی گئی اور اس امید کا اظہار کیا گیا کہ اسے بہت جلد عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ پنجاب کے بعد صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اس فیصلے پر صاد کیا۔ خیر پور اور صوبہ سرحد کی تائید اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہی علاقوں سے مخالفت کی توقع کی جا رہی تھی۔ ۲۴ اکتوبر سے پیشتر وحدتِ مغرب کی مخالفت میں سب سے پیش پیش سندھ کا صوبہ یعنی بالفاظ دیگر سندھ کے وہ اصحاب اقتدار تھے جو بلا استحقاق مناصب پر قابض تھے۔ لیکن سندھ میں جو سیاسی تبدیلی آئی اس سے ذہنیتوں میں بھی انقلاب آ گیا۔ یہاں تک کہ ۱۱ دسمبر کیلئے سندھ اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی جس میں وحدتِ مغرب سے متعلق رائے دینا تھی۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ مسٹر کھوڑو نے دو ایک روز پیشتر وثوق سے کہدیا تھا کہ سندھ اسمبلی اس تجویز کی حمایت کرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک سو چار ارکان میں سے ایک سو ارکان نے اس کے حق میں ووٹ دیا۔ اور تو اور غیر مسلم حزبِ اختلاف نے بھی اس پر صاد کیا اور اسے سندھ کے لئے مفید قرار دیا۔ سندھ کا حمایت کا اعلان کرنا تھا کہ ملک کی آنکھیں کھل گئیں اور یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی کہ کوئی ذی ہوش اور وطن خواہ اس تجویز کی مخالفت کر ہی نہیں سکتا۔ ملک نے یک زبان ہو کر وحدت پر صاد کیا تو صوبوں کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ اور ریاستوں کے نمائندے کراچی میں جمع ہوئے۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر نہ محض تمام مغربی پاکستان نے وحدت کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا بلکہ ماہرین کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ بھی تیار کر لی تھی اور اس رپورٹ پر کابینہ نے غور بھی کر لیا تھا۔ اس کانفرنس کے خاتمہ پر گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے مغربی پاکستان کی ایک مجلس انتظامی کی تشکیل کا اعلان کیا جس میں سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ اور بلوچستان کے اے جی جی شریک ہوں گے۔ وزیر اعظم خیر پور، میر بھاولپور اور وزیر اعظم قلات کو بہ حیثیت اپنے علاقوں کے نمائندوں کے اس کانفرنس کے ساتھ منسلک کیا جائے گا۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہوگا کہ وحدت مغربی پاکستان کے قیام کی تفاصیل طے کرے اور ملازمتوں اور دیگر متعلقہ معاملات کے متعلق مناسب فیصلے کرے۔ ان مقاصد کیلئے وہ جس قسم کی کمیٹی چاہے تشکیل کر سکتی ہے۔

وحدت کا نقشہ گورنروں اور وزرائے اعلیٰ وغیرہ کی کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ یونٹ کا نقشہ بالکل صوبے کا سا ہو۔ یعنی ایک گورنر ہو، ایک کابینہ، ایک اسمبلی اور ایک سکریٹریٹ۔ نئے صوبے میں پچاس اضلاع اور ایجنسیاں ہوں گی اور دس کمشنریاں۔ کمشنروں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے تاکہ وہ معاملات کو زیادہ حد تک مقامی طور پر خود ہی نپٹا سکیں۔ قبائلی علاقے اور کراچی (ماسوائے وفاقی علاقہ) جو اس وقت مرکز کے تحت ہیں وہ سب نئے صوبے میں شامل ہوں گے۔ کراچی کا جو حصہ مرکز کے ماتحت رہے گا وہاں ایک کمشنر متعین کیا جائے گا۔ ضمنی طور پر اس سے کراچی کی پوزیشن بالکل واضح ہو جاتی ہے اور یہ ڈر نہیں رہتا کہ مرکز کے ماتحت ہونے کی حیثیت سے وہ ایک علیحدہ یونٹ بن جائے گا۔ یہ خدشہ حقیقی تھا کیونکہ جب سے ایک یونٹ کی تجویز کا اعلان ہوا ہے اصحاب غرض اس کوشش میں تھے کہ کراچی علیحدہ یونٹ بن جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو نہ محض مغربی وحدت ناتمام رہ جاتی بلکہ جنگ اقتدار کا ایک اور

اڈہ قائم ہوجاتا۔ جو نیا صوبہ بنے گا اس کے اختیارات فی الحال ایک موجودہ صوبے کے برابر ہوں گے، البتہ بعد میں مرکز اور مشرق اور مغرب کے دونوں صوبوں کے مابین تقسیم اختیارات کا تصفیہ ہوگا۔ قبائلی علاقے کے نظم و نسق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی۔ نئی حکومت میں قبائلی علاقے کے لئے ایک ریزیڈنٹ وزیر مقرر کیا جائے گا۔ جو ان کی رفاہ پر خصوصی توجہ دیگا۔ مغربی پاکستان کی معاشی ترقی کیلئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایک نیم خودمختار "پاور اینڈ پراجیکٹ اتھارٹی"[1] قائم کی جائے جو تمام ترقیاتی منصوبوں کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ہائی کورٹ سے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اس کا فیصلہ فیڈرل کورٹ کے مشورے سے ہوگا۔ اور اس کا بعد میں اعلان کردیا جائیگا۔

چونکہ چھوٹے صوبوں کی تسلی کے لئے دس سال تک انھیں مناسب تحفظات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس لئے ملازمتوں میں موجودہ علاقائی تناسب باقی رکھا جائے گا۔ نیز جو ملازمتیں ضلعوں یا متعلقہ علاقوں تک محدود تھیں وہ بدستور سابق رہیں گی۔ یہ علاقائی تناسب دس سال تک رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ قبائلی علاقے کا تناسب دس سال کے بعد بھی رہے۔ یہ تحفظات اصولی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض نظر آتے ہیں لیکن چونکہ وحدت کے لئے جس انقلاب فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ ہنوز تشکیل نہیں ہوا اس لئے ان تحفظات کی ضرورت قابلِ فہم ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک دس سال کا عرصہ بہت لمبا ہے۔ یہ تحفظات زیادہ سے زیادہ تین سال تک کے لئے ہوتے تو مناسب تھا تاکہ جسقدر جلد ممکن ہو ہر پاکستانی بہ حیثیت پاکستانی معیار قابلیت کی بنا پر ہر شعبہ میں لیا جاتے۔

گورنر جنرل نے بذریعہ آرڈیننس جو انتظامی کونسل مقرر کی ہے اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوچکا ہے اس میں کونسل نے مسٹر گورمانی، گورنر پنجاب کو اپنا کنونیئر مقرر کیا اور چار کمیٹیاں مقرر کیں جو متفرق مسائل متعلقہ کی تفاصیل طے کریں گی۔ کونسل کا آئندہ اجلاس پشاور میں ۸ر جنوری کو منعقد ہوگا۔

اہم قدم موجودہ مرکزی حکومت کی تکمیل کے سلسلہ میں جو اہم قدم اٹھایا گیا ہے اور جو ایک عرصے سے قیاس آرائیوں کا موضوع بنا ہوا تھا، مسٹر سہروردی کی شمولیت ہے۔ مسٹر سہروردی نے پاکستان میں عوامی لیگ قائم کی لیکن جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی وہ منظم حزب اختلاف نہیں بن سکی۔ یہ طرفہ تماشا ہے (اور علیحدہ بحث کا موضوع) کہ پاکستان میں مسلم لیگ برسر اقتدار جماعت تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کی جماعتی حیثیت ختم ہو کے رہ گئی۔ اب یہ صورت ہے کہ مرکز میں مسلم لیگ کی حکومت بھی نہیں رہی۔ اس کے احیاء کی اب تک جتنی کوششیں ہوئیں وہ کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکیں۔ اِدھر یہ جماعت ختم ہوگئی اور اُدھر کوئی دوسری جماعت ابھر نہیں سکی۔ آنے والے انتخابات کے سلسلہ میں پارٹیوں میں تحریک ضرور پیدا ہوگی لیکن مستقبل کے امکانات کیا ہیں وہ اس تبصرے کی حدود سے خارج ہیں۔ بہرکیف عوامی لیگ کی تنظیمی صورت یہ ہے کہ مسٹر سہروردی ابھی تک اس کے کنونیئر ہیں۔ مغربی پاکستان کے صوبوں میں اس کی "شاخیں" ہیں لیکن وہ اس حد تک مقامی شخصیتوں کی رہینِ منت ہیں کہ انھیں مرکزی جماعت کی شاخیں تکلفاً ہی کہا جاسکتا ہے مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ مولانا بھاشانی کے زیر صدارت "مرکز" سے آزاد تھی۔ لیکن بنگال میں جب انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں نے منفی اساس پر تعاون کرکے ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی میں مسٹر سہروردی کا بھی ہاتھ تھا گو زیادہ حصہ مولوی فضل الحق اور مولانا بھاشانی کی ذات کا تھا۔ کامیابی کے بعد اس نام نہاد "متحدہ" محاذ میں سر پھٹول شروع ہوا

[1] اس ضمن میں لمعات بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ تجویز زیادہ موزوں نظر آتی ہے۔

اور بڑی مشکل سے مولوی فضل الحق نامکمل وزارت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ وہ وزارت بھی فضل الحق کی غیر ذمہ دار تقریروں اور بیانات کی بدولت برقرار نہ رہ سکی۔ اس وقت سے لیکر اب تک متحدہ محاذ کے اختلافات اور شدت اختیار کر گئے۔ اس کے علاوہ مولوی فضل الحق کے خلاف فضا پیدا ہونا شروع ہوگئی اور کوششیں شروع ہوگئیں کہ وہ پھر سے وزارت مرتب نہ کر سکیں۔ مولانا بھاشانی کئی ماہ سے انگلستان میں مقیم ہیں اور ان کی واپسی کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔ ان حالات میں عوامی لیگ اور مسٹر سہروردی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی اور مشرقی پاکستان کے مستقبل کا دارومدار انہی کے فیصلہ پر ہوگیا۔ وہ ۱۲ دسمبر کو پاکستان واپس آئے۔ ان کے آنے پر مشرقی پاکستان میں کافی ہل چل مچ گئی کیونکہ جملہ ارباب سیاست کی یہ کوشش تھی کہ وہ ان سے مل کر اپنے لئے جگہ پیدا کرلیں۔ متحدہ محاذ تو ایک طرف خود عوامی لیگ میں جنگ اقتدار شروع تھی۔ گورنر جنرل اور مسٹر سہروردی کی ملاقاتوں کے ساتھ مولوی فضل الحق اور گورنر جنرل کے مابین بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ کراچی میں مولوی فضل الحق اور مسٹر سہروردی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ ان ملاقاتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مسٹر سہروردی کو مرکزی حکومت میں شریک کر لیا گیا ہے۔ انھیں قانون کا قلمدان دیا گیا ہے جس میں دستوری امور اور انتخابات بھی شامل ہیں۔

مسٹر سہروردی کی شمولیت ان کے حزبی انتساب کی بدولت نہیں بلکہ جیسا کہ انھوں نے وزیر بننے کے بعد ایک بیان میں کہا موجودہ حکومت پارٹی حکومت نہیں لیکن ان کی شمولیت سے مشرقی پاکستان کی سیاست پر ضرور اثر پڑیگا اور ہوسکتا ہے کہ انہی کی رائے کو ترجیح دی جائے۔ یہ اندازہ کرنا قبل از وقت ہے کہ مشرقی پاکستان پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ گورنر جنرل اور مسٹر سہروردی عنقریب اس صوبے کا دورہ کریں گے اور پھر کچھ فیصلہ کریں گے۔ مسٹر سہروردی کی شمولیت کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ حکومت دونوں حصص ملک کی نمائندہ ہوگئی ہے۔ اب پیش نظر دستور کی تسوید زیادہ اعتماد سے کی جاسکے گی۔

ہندوستان سے روابط

مسٹر سہروردی نے بھی اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ ہندوستان سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے حق میں ہیں۔ اس سے پیشتر گورنر جنرل ایک ذاتی پیغام میں پنڈت نہرو کو باہمی تنازعات کے حل کی دعوت دے چکے ہیں۔ ان کے وزیر اعظم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پنڈت نہرو کو دعوت دی کہ وہ جنوری میں کراچی آئیں اور مذاکرات کی طرح ڈالیں۔ پنڈت نہرو نے جواب میں ملاقات پر رضامندی کا اظہار کیا ہے البتہ جنوری میں کراچی آنے میں معذوری ظاہر کی ہے کیونکہ وہ اس مہینے میں اور کاموں میں مصروف ہوں گے۔ اب یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ فروری میں دونوں وزرائے اعظم میں باقاعدہ ملاقات ہوجائیگی اور مذاکرات باہمی کا نیا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ ویسے اس سے پیشتر اس ماہ کے آخر میں انڈونیشیا میں جو کولمبو ممالک کی کانفرنس ہو رہی ہے اس میں دونوں کی ملاقات ہوگی اور مبادیات طے ہوسکیں گی۔ جنوری میں دونوں لندن کی دولت مشترکہ کی کانفرنس میں بھی ملیں گے اور مزید تبادلہ خیالات کر سکیں گے۔ ہندوستان سے متعلق ایک اہم تنازع یعنی دریائی پانی کی تقسیم کے مسئلہ پر واشنگٹن میں پھر سے مذاکرات شروع ہوگئے ہیں۔ یہ مذاکرات کئی ماہ سے تعطل میں پڑے ہوئے تھے۔ اس موقع پر عالمی بنک نے اپنی ان تجاویز کو شائع کر دیا جس کی بنا پر مذاکرات شروع ہوئے ہیں۔ یہ تجاویز سرکاری طور پر پہلی بار شائع ہوئی ہیں لیکن اب تک جو اطلاعات اخبارات میں آچکی ہیں ان سے چنداں مختلف نہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ چناب، جہلم اور سندھ کے پانی پاکستان کے حصے میں آئیں گے البتہ جہلم کا معمولی سا پانی جموں اور کشمیر میں استعمال ہوسکے گا۔ ہندوستان،

ستلج، بیاس اور راوی کو استعمال کرے گا۔ عبوری دور کے لئے پاکستان ان دریاؤں کے استعمال کا مجاز ہوگا۔ یہ عبوری دور اس وقت تک ہوگا جبتک پاکستان نئی نہریں نکال کر اس پانی سے مستغنی نہیں ہو جاتا۔ بنک نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ پاکستان یا ہندوستان مجبور نہیں کہ ان تجاویز کو مانیں۔ وہ اس میں حسب ضرورت کمی بیشی کر سکتے ہیں۔ گویا مفاہمت کی کافی گنجائش ہے لیکن ہندوستان سے بار بار مذاکرات کے ذریعہ متنازعہ فیہ امور کے حل کی کوشش کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں

کبھی سنا کرتے تھے کہ "مومن ایک سوراخ سے کبھی دو دفعہ نہیں ڈسا جایا کرتا" لیکن ایک ہم "مومن" ہیں کہ ہر بار ناگ ڈسے جا رہا ہے اور ہم اسی سوراخ میں انگلی دیئے جا رہے ہیں۔ سچ ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

پاکستان میں نظامِ شریعت رائج ہونا چاہئے

لیکن یہ نظامِ شریعت ہوگا کیا؟

(۱) اقتدارِ اعلیٰ خدا کا۔ اطاعت صرف اس کی ـــــ (۲) خدا کی اطاعت کے معنی ہیں اس کی وحی کی اطاعت۔ ـــــ (۳) ایک وحی قرآن میں ہے لیکن وہ مجمل ہے ـــــ (۴) اس اجمال کی تفصیل دوسری وحی میں ہے جس کا نام احادیث ہے ـــــ (۵) لہٰذا خدا کی اطاعت سے مراد احادیث کا اتباع ہے۔

لیکن ـــــ احادیث غلط بھی ہیں اور صحیح بھی ـــــ یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ ـــــ یہ صرف . . . . . مزاج شناسِ رسول بتا سکتا ہے؟ ـــــ یہ مزاج شناس کون ہیں؟ ـــــ اس کی تفصیل ادارۂ طلوع اسلام کی تازہ ترین پیشکش

مزاج شناسِ رسول

میں دیکھئے ضخامت ۴۸۸ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

اسلامی نظام دورِ حاضرہ کی ایک بلند پایہ کتاب جسمیں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم صاحب جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنھوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھولدی ہیں۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے۔

قرآنی دستور پاکستان آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی پیشکش قرآن کی روشنی میں۔ مسودات قرارداد مقاصد و بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کے دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گردپوش۔ دو پے آٹھ آنے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

نوادرات علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت صرف چار روپے۔

اسباب زوال امت (پرویز) دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس میں قوم کے سنجیدہ تعلیمیافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ مجلد طلائی گردپوش۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

قرآنی فیصلے دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن پاک کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے بے نیاز کر دے گی ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے۔

جشن نامے بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع ایسے ایسے عنوانات جنھیں پڑھکر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز اور تنقید کے ایسے گہرے نشتر، اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں۔ یہ کتاب ہمارے سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے۔

معراج انسانیت: مفصل اشتہار صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت بیس روپے

مزاج شناس رسول: " ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں قیمت چار روپے۔

اسلامی معاشرت: " " آخری " " قیمت دو روپے

مقام حدیث: " " " " " قیمت جلد اول چار روپے جلد دوم چار روپے۔

ابلیس و آدم: مفصل اشتہار صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

اگر بنیاد کمزور ھے تو ۔

..... مکان کبھی پختہ نہیں بن سکتا ۔

اگر آپ چاھتے ھیں کہ آپ کی قوم صحیح اسلامی کردار کی حامل ھوتو ....

اپنے بچوں کو صحیح اسلامی تعلیم دیجئے ۔

صحیح اسلامی تعلیم کے لئے ایسی کتاب کی ضرورت ھے جس میں اسلام کی صحیح صحیح تصویر پیش کی گئی ھو ۔

یہ کتاب ھے ۔

اسلامی معاشرت

جسے جناب پرویز نے بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے خاص طور پر لکھا ھے ۔

اور جسے ادارہ طلوع اسلام نے خاص اھتمام سے شائع کیا ھے ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ قیمت (مجلد مع گرد پوش) -/۲ روپے ۔

(علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی

قرآن اور حدیث

دونوں دین کے رکن ھیں !

کیا یہ ٹھیک ھے ؟

ٹھیک ھے تو کسطرح ۔ اور غلط ھے تو کیوں ؟

کیا ان دونوں کی حیثیت ایک جیسی ھے ؟

اگر نہیں تو پھر ان کی حیثیت کیا ھے ؟

ان تمام اھم سوالات کے تفصیلی جواب کے لئے ۔

مقام حدیث

ملاحظہ کیجئے جس میں آپ کو احادیث کے متعلق اتنی معلومات حاصل ھونگی جو کسی اور جگہ یکجا نہیں مل سکینگی ۔

کتاب دو جلدوں میں مکمل ھوئی ھے ۔ ھر جلد کی ضخامت قریب چارسو صفحات اور قیمت فی جلد (مجلد سعہ گردپوش) چار روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ - کراچی

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Rd., Karachi. and Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi Published by Said Amhed from Tulu-e-Islam Office Karachi.